صفا



دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد



دارالعلوم سبیل السّلام حیدرآباد کی

زیرتعمیر جدید عمارت (درس گاہ) کا ایک حصّہ - اسکی تکمیل انشاءاللہ جلد ہو جائیگی

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کا علمی، دینی، ادبی سہ ماہی رسالہ

صفا

- شمارہ: ۴
- جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب ۱۴۰۹ھ
- مطابق:
- جنوری، فروری، مارچ ۱۹۸۹ء

مدیر اعلیٰ
محمد رضوان القاسمی

مدیر
خالد سیف اللہ رحمانی

سالانہ:	۴۰/- روپے
معاون خصوصی	۱۰۰/- روپے
فی پرچہ:	۱۰/- روپے

ناشر

شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم سبیل السلام پوسٹ بالاپور حیدرآباد ۵۰۰۰۵ انڈیا۔

فون: ۲۳۹۲۸۵۰

سید مسعود احمد

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

اس شمارہ کے ساتھ "صفا" کی ایک جلد مکمل ہوتی ہے اور آئندہ شمارہ سے وہ نئے سال میں قدم رکھے گا اس مختصر مدت میں اہلِ ذوق اور اہلِ علم کی طرف سے اس رسالہ کا جس طرح خیر مقدم ہوا ہے وہ اس کے خادموں کے لئے حد درجہ حوصلہ افزا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ غیر دینی اور غیر اخلاقی صحافت کے اس طوفان اور بے مقصد یا خسیس مقاصد پر مبنی ادب کے اس سیلاب میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود ہے، جو اخلاقی، علمی اور دینی لٹریچر کا بھی خواہ اور با مقصد ادب کا دلدادہ ہے ——— ہم اس موقع پر خدا کے حضور سپاس گذار ہیں اور ان قارئین اور علم دوست اہلِ ذوق کے بھی، جنہوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں سرفراز کیا، ہمیں کثرت سے ایسے خطوط موصول ہو رہے ہیں، جن میں "صفا" کو ماہانہ کر دینے کی خواہش کی گئی ہے، ہم خود بھی اس پر غور کر رہے ہیں، ہماری کوشش ہے کہ اس سلسلہ میں جو دشواریاں ہیں ہم ان پر جلد قابو پالیں اور جب "صفا" کی تیسری جلد شروع ہو تو اس کو "ماہانہ" کر دیا جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

پاکستان میں "ضیاء الحق شہید" کی شہادت کے بعد جو غیر یقینی حالات پیدا ہو گئے تھے وہ بالآخر ایک جمہوری حکومت کے قیام پر ختم ہوئے، پاکستان کا حالیہ انتخاب دراصل دائیں اور بائیں قوتوں کے درمیان زبردست معرکہ تھا۔ مذہبی اور دینی رجحانات رکھنے والی جماعتیں "اسلامی جمہوری اتحاد" کے تحت اور بائیں بازو کی تحریکیں "پیپلز پارٹی" کے پرچم تلے جمع ہو گئی تھیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت شہید مرحوم کے بااعتماد رفیق نواز شریف اور پیپلز پارٹی کی ذوالفقار علی بھٹو کی دختر "بے نظیر بھٹو" کر رہی تھیں۔ گو اکثریت کسی بھی جماعت کو حاصل نہ ہو سکی، تاہم قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھری، پھر مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے بھی اس کی تائید کی، اس طرح بے نظیر بھٹو ملک کی وزیر اعظم مقرر ہو گئیں۔

پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا اور اس کے لئے برصغیر کے مسلمانوں نے بڑی قربانی دی تھی، مگر بد قسمتی سے اسلام ہی ہے، جس کو اب تک پاکستان میں اس کا مقام نہیں مل سکا ہے، فوج اکثر وہاں حکومت پر قبضہ کرتی رہی ہے، ۱۹۷۰ء سے پہلے ملک میں انتخاب ہوا جس میں شیخ مجیب کی عوامی لیگ نے کامیابی حاصل کی، مگر ذوالفقا

کی وزارتِ عظمیٰ کی خواہش نے انگڑائی لی اور جمہوری حکومت قائم نہ ہو سکی، یہاں تک کہ نوبت پاکستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش کے وجود تک آگئی، بھٹو دورِ حکومت میں ملک اسلام کے قریب آنے کے بجائے اسلام سے دور ہوتا چلا گیا، ۱۹۷۷ء کے انتخاب میں انہوں نے ایسی دھاندلی کی کہ پورے ملک میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی، بالآخر فوجی انقلاب آیا اور ضیاء الحق صدر مملکت بن گئے۔

انہوں نے گیارہ سال سے زیادہ عرصہ پاکستان پر حکومت کی اور پورے خلوص و دلسوزی کے ساتھ نفاذِ اسلام کی سعی کی، اسلامی حدود کو جاری کرنے کی کوشش کی، عشر و زکوٰۃ کا نظام قائم کیا، نمازوں کے اہتمام کے لئے سعی ہوئی، ٹی وی اور ریڈیو سے غیر اخلاقی عنصر کو ختم کیا گیا، خواتین کے لئے ساتر لباس کو قانوناً ضروری قرار دیا گیا۔ اسی کے ساتھ پاکستان کو زبردست معاشی اور فوجی مدد دلائی، مسئلہ افغانستان پر روس جیسی بڑی طاقت کو جھکایا ہندوستان کے بار بار دورے کئے اور شاید وہ واحد صدر مملکت ہیں کہ ان کے عہد میں کوئی ہند و پاک جنگ نہیں ہوئی۔

مگر اس بات پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے کہ اسلامی تنظیموں اور جماعتوں نے ملک کو اسلامیانے کی مہم میں ان کی کوئی مدد نہیں کی، بلکہ الٹے ان کی مخالفت کر کے اسلامی کاز کو کمزور کیا، اس لئے کہ پاکستان میں اسلامی تنظیموں اور جماعتوں کو یہ فکر نہیں ہے کہ اس ملک میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ عمل میں آئے، بلکہ دلچسپی صرف اس بات سے ہے کہ ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آجائے اور اسلام ان کے زیر سایہ نافذ ہو، علماء نے بھی آپسی ریشہ دوانیوں اور جماعت بندیوں کے ذریعہ اپنا وقار کھو دیا اور عوام کے دلوں تک اسلام کے پیغام کو پہونچانے کی سعی نہ کی ——— دوسری طرف داخلی اور بیرونی اسلام مخالف قوتیں سر جوڑ کر ضیاء الحق مرحوم کی اس تحریک کو کمزور کرنے کے لئے کوشاں رہیں۔ چنانچہ اس وقت مشرق و مغرب اور دور و قریب کی جتنی اسلام مخالف قوتیں ہیں، سبھی بے نظیر کے برسر اقتدار آنے پر طبعی بات ہے کہ بہت مسرور ہیں۔

بے نظیر بھٹو کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ "ہمدردی کا ووٹ" ہے، وہ ہمیشہ اپنے والد کو، جو دراصل اپنے سیاسی حریف کے قتل میں ملوث تھے اور اسی جرم میں تختۂ دار پر چڑھائے گئے ——— اس طرح پیش کرتی رہی ہیں کہ گویا انہوں نے جمہوریت کے تحفظ کے لئے اپنی جان دی ہو، بے نظیر کی کامیابی کی ایک وجہ "سندھی عصبیت" بھی ہے، جس کی جڑیں پاکستان کے صوبہ سندھ میں بہت گہری ہو چکی ہیں ——— تاہم ضیاء الحق مرحوم کے ہم نواؤں نے قومی اسمبلی میں جو حیثیت حاصل کی ہے اور جس طرح ملک کی دو ریاستوں پنجاب اور بلوچستان میں اپنی حکومت قائم کرنے اور سرحد میں ایک مضبوط اپوزیشن بننے میں کامیابی حاصل

کی ہے، یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ شاید کوئی فوجی حکمراں ہو، جس نے عوام کے دلوں میں اپنی محبت کی جڑیں اس قدر گہری کرنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔

تاہم اس امر پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے کہ پاکستان جو خالص اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور جس کی قربانگاہ پر برصغیر کے مسلمانوں کے اتنے خون بہے ہیں کہ تاریخ اس کو کبھی فراموش نہ کرسکے گی، مگر یہی وہ خطۂ ارضی ہے، جہاں اسلام کا نفاذ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے اور عالمِ اسلام کی جدید تاریخ میں جہاں پہلی دفعہ ایک خاتون کو زمامِ اقتدار سونپی گئی ہے اور اسلام کے اس تصور پر ضرب کاری لگائی گئی ہے کہ سیاسی قیادت مردوں کا حصہ ہے، نہ کہ عورتوں کا، یہ مسئلہ مسلمانوں کے درمیان ابتداء سے اجماعی اور غیر نزاعی رہا ہے "المجتمع" (کویت) کے استفسار پر علماء ازہر ڈاکٹر رؤف شبلی، ڈاکٹر حسن شاذلی، ڈاکٹر عبد المعطی اور ڈاکٹر جواد ضاوی کا متفق علیہ اور محققانہ جواب مذکورہ مجلہ میں شائع ہو چکا ہے۔ دیارِ اسلام میں اسلام کی بدقسمتی اور یہ بیچارگی یقیناً ہر ایسے شخص کو تڑپا دینے والی ہے جو دین پر یقینِ واثق اور شریعتِ مطہرہ پر غیر متزلزل اور کامل عقیدہ رکھتا ہو۔

کچھ لوگ اس طرح کی باتوں کا اظہار کر رہے ہیں کہ وزارتِ عظمیٰ پاکستان کے مسئلہ پر اسلام کے چوکھٹے میں بحث کرنا ہی درست نہیں، اسلئے کہ ہند و پاک کا دستور برطانوی دستور کے ڈھانچہ پر ہے، مگر ظاہر ہے اس طرح کی توجیہ کوئی وزن نہیں رکھتی، پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور پاکستانی دستور میں کتاب و سنت کی بالاتری کو تسلیم کیا گیا ہے، پھر پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ کے مسئلہ پر کسی عورت کو فائز کیا جانا کس طرح موافق شریعت، مطابقِ دستور کہلا سکتا ہے؟ ——— بعض حضرات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعۂ جمل میں شرکت سے عورتوں کی قیادت و سربراہی کے جواز پر استدلال کرتے ہیں، یہ بھی زبردست مغالطہ ہے حضرت عائشہ رضؓ صرف حضرت عثمان رضؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے کے لئے فوج کے ساتھ ہو گئی تھیں، نہ آپ اس فوج کی امیر تھیں نہ قائد۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس عمل پر بھی خود ان کے بھائی، نیز حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے صحابۂ کرامؓ نے تنقید کی، حضرت ام سلمہؓ نے باضابطہ تنقیدی مکتوب لکھا اور مآل کار خود حضرت عائشہ رضؓ کو اپنی چوک کا احساس ہوا اور بعد میں اس پر سخت ندامت اور پشیمانی کا اظہار فرمایا۔ ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے تنہا اسی واقعہ سے استدلال حیرت انگیز ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اسلامی مملکت کی حفاظت فرمائے اور اس کو اسلام کا

صحیح نمائندہ اور ترجمان بنائے۔

عالمِ اسلام میں اس وقت یہ بات خوش آئند ہے کہ مسئلۂ فلسطین کے کسی حد تک حل ہونے کا امکان پیدا ہو گیا ہے، تحریکِ فلسطین نے جلا وطن حکومت قائم کر لی ہے اور "حق بحقدار رسید" کے مصداق یاسر عرفات اس کے سربراہ منتخب ہو چکے ہیں، اسرائیل اور امریکہ پر عالمی دباؤ اس مسئلہ کے حل کی بابت بڑھتے جا رہے ہیں، عالمی رائے عامہ کے فلسطین کی حمایت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ نے متعینہ ضوابط اور معاہدہ کے برخلاف جب یاسر عرفات کو ویزا دینے سے انکار کر دیا تو صرف ان کے خطاب کو سننے کی غرض سے امریکہ و اسرائیل کو چھوڑ کر پوری دنیا نے اقوامِ متحدہ کا خصوصی اجلاس جنیوا میں طلب کیا ہے۔

دوسری طرف مسئلۂ افغانستان پر بھی سعودیہ عربیہ میں مجاہدین اور روسی نمائندوں کے درمیان براہِ راست مذاکرات منعقد ہوئے ہیں، جو ایک بہتر علامت ہے اور توقع ہے کہ اس کی وجہ سے مسئلہ زیادہ آسانی سے حل ہو سکے گا، کیونکہ مجاہدین نے اب تک جنیوا کے معاہدے کو تسلیم نہیں کیا تھا، اب ان مذاکرات میں وہ خود ایک فریق کی حیثیت سے شریک ہے —— پھر مسرت کی بات یہ ہے کہ اب یہ مسئلہ یورپ اور مغرب کے کسی شہر کی بجائے ایک اسلامی مملکت کے واسطہ سے خود اس کی سرزمین میں حل ہو رہا ہے۔

ادب طریقۂ اظہار کا نام ہے، کسی بات کو اس طرح کہنا کہ وہ سامع اور قاری کے دل کو چھو لے، یہی ادب کا کمال ہے، تاہم اس قوت کا استعمال انسانی اور اخلاقی مقاصد کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور غیر اخلاقی اور غیر دینی مقاصد کے لئے بھی؛ اردو زبان شروع سے دین و اخلاق کی آغوش میں پلی اور یہیں جوان ہوئی ہے، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا محمد الطاف حسین حالی، مفسرِ قرآن ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی نعمانی کو اردو کا چار ستون تسلیم کیا گیا ہے، ان چاروں کی تحریریں عموماً دینی، مذہبی، اصلاحی اور اخلاقی نوعیت کی ہیں، اردو کی اسلام سے اس وابستگی نے حسان العصر اور رومیِ وقت علامہ اقبال کو پیدا کیا، جن کی طاقتور، غیرتِ ایمانی سے بھرپور اور جوش و خروش سے معمور شاعری نے مسلمانوں میں ایک نئی روح سی پھونک دی۔

مگر افسوس کہ اردو ادب کی اقلیم اب مذہب پسند ادیبوں اور اخلاقی اور اصلاحی قدروں کا احترام کرنے والے اہلِ قلم سے خالی ہوتی جا رہی ہے، اور اس مملکت پر بھی ان عناصر کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے جو دین و اخلاق سے

تمسخر، لب و عارض سے کھلواڑ اور روٹی، کپڑے اور مکان کے مسائل کی پرستاری و ترجمانی ہی کو حاصلِ ادب تصور کرتے ہیں ——— اور اس سے زیادہ قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ خود اسلام کی سرکاری زبان "عربی زبان" میں بھی یہی رجحان تیزی سے نفوذ کرتا جارہا ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ بالغ نظر اہلِ علم کو اس طرف توجہ ہوئی ہے اور انہوں نے اسلامی ادبیات کی طرف توجہ کی پرجوش دعوت دی، جن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، سید قطب شہید، محمد قطب، انور الجندی اور ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ——— اس دعوتِ دینیہ نے اس وقت باضابطہ تحریک کی صورت اختیار کرلی جب ندوہ (لکھنؤ) کے زیرِ اہتمام ۱۷ تا ۱۹ اپریل ۱۹۸۱ء میں "مذاکرہ ادبِ اسلامی" منعقد ہوا اور ندوہ ہی میں اس کا باضابطہ سکریٹریٹ قائم ہوا۔

گذشتہ دنوں، ۸، ۹ اکتوبر ۸۸ء کو اسی سلسلہ میں ایک اجلاس "نعتیہ شاعری علمی و تاریخی جائزہ" کے موضوع پر اس سکریٹریٹ کے زیرِ اہتمام اور مدرسہ کاشف العلوم کے زیرِ انتظام جنوبی ہند کے تاریخی شہر "اورنگ آباد" میں منعقد ہوا، راقم الحروف کو بھی اس میں شرکت کا شرف حاصل ہوا جس میں ہندوستان بھر کے اکثر نمائندہ علمی و ادبی ادارے کے وفود نے شرکت کی، پاکستان سے سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے شاگردِ رشید مولانا محمد اشرف سلیمانی اپنی کبر سنی اور معذوری کے باوجود شریک ہوئے، سعودیہ عرب سے بھی دو اہلِ علم آئے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت اور افتتاحی خطاب نے اس تقریب کو نہایت مؤثر اور دل آویز بنا دیا تھا ——— راقم سطور نے روزنامہ سیاست اس مذاکرہ پر ایک تاثراتی رپورٹ بھی لکھی تھی، جس کا ایک حصہ "تعمیرِ حیات" (۱۰ نومبر ۱۹۸۸ء) میں بھی شائع ہوا۔ ضرورت ہے کہ وقتاً فوقتاً اس طرح کے مذاکرات منعقد کئے جائیں، تاکہ صالح اور تعمیری ادب کو فروغ و ترقی حاصل ہو۔

اہلِ علم ایک عرصہ سے ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ اردو زبان میں خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ پر بھی ایک ایسی کتاب سامنے آئے جو ہر طرح کے غلو اور افراط و تفریط سے پاک، خالص علمی اور تحقیقی رنگ لئے ہوئے معتبر و مستند ہو اور جس کو پڑھنے کے بعد حضرت علیؓ کی حقیقی اور سچی تصویر نگاہوں کے

سامنے آئے، لیکن جن لوگوں کی نظر حضرت علیؓ کے دور پر ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ ایسی کسی خواہش کا کرنا آسان تو ہے، مگر اسے عملی جامہ پہنانا نہایت مشکل ہے، تاہم اللہ تعالےٰ جسے اپنی توفیقِ خاص سے نوازیں، اس کے لیے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے، چنانچہ یہ توفیقِ خاص عصر حاضر کے عظیم مؤرخ اور تاریخ دعوت و عزیمت کے بالغ نظر مرتب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو عطا ہوئی اور انہوں نے "المرتضیٰ" کے نام سے حضرت علیؓ کی مفصل سوانح حیات مرتب فرمائی، اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہے کہ "علی میاں" نے "علی مرتضیٰ" کی سیرت پر لکھنے کا بڑی حد تک حق ادا کیا ہے اور شروع سے آخر تک حقیقت و واقعیت اور عقیدت و محبت دونوں کو ایک خاص توازن کے ساتھ لے کر ان کا قلم چلا ہے۔ کسی کی حیات اور افکار میں یہ توازن بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے، اور واقعہ ہے کہ مصنف کی سب سے بڑی خوبی اور ان کا یہ امتیازی وصف ہے، جس کی جھلک ان کی ہر تقریر اور تحریر میں پائی جاتی ہے۔ شاید "نقوشِ اقبال" کے مصنف پر اقبال کے اس شعر کا گہرا نقش ہو ؎

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل ؛ یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بارِ دوش ہے

یا مصنف کے ہم وطن شاعر سحر لکھنوی کا یہ شعر ان کے پیشِ نظر ہو ؎

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری ؛ کہ آشیانہ کسی شاخِ گُل پہ بار نہ ہو

کتاب "المرتضیٰ" کی عظمت و اہمیت کے پیشِ نظر آل انڈیا مسلم انٹلیکچول فورم" کے ذمہ داروں نے یہ چاہا کہ اس کی رسمِ اجراء کی تقریب منعقد کی جائے، جن میں فورم کے صدر پروفیسر محمد رضوان علوی (لکھنؤ یونیورسٹی) نائب صدر پروفیسر محمد راشد (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد یونس نگرامی (لکھنؤ یونیورسٹی) کے اسماء خصوصیت کے ساتھ لئے جاسکتے ہیں، ان حضرات کی خصوصی دلچسپی اور مشترکہ جدوجہد سے ۶ر نومبر ۱۹۸۸ء یکشنبہ کو گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد لکھنؤ میں ۹½ بجے دن یہ تقریب اعلیٰ پیمانہ پر منعقد ہوئی، جس کا سلسلہ چار گھنٹے تک جاری رہا، ملک کے اہم تعلیمی، تحقیقی تصنیفی اداروں اور جامعات کے ممتاز فضلا اور دانشور بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور تقریب کی مناسبت سے صاحبِ کتاب مولانا علی میاں کی شخصیت اور ان کی کتاب "المرتضیٰ" کی علمی اور تاریخی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جن حضرات نے اس میں حصہ لیا ان میں امیر شریعت بہار و اڑیسہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی، مرکزی وزیر ماحولیات ضیاء الرحمن انصاری،

مفسرین قرآن مولانا عبدالکریم پاریکھ، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی (دارالمصنفین اعظم گڑھ) پروفیسر خلیق احمد نظامی اور ڈاکٹر طفیل احمد مدنی کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا کی یہ کتاب بڑے سائز کے (۴۶۴) صفحات پر مشتمل ہے، مولانا نے یہ کتاب اپنی دوسری اہم کتابوں کی طرح اصلاً عربی میں تحریر فرمائی ہے، جس کا اردو ترجمہ مشہور فاضل مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی پھلواروی (سابق استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ، و حال معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے کیا ہے۔ عربی ایڈیشن دارالقلم دمشق سے اور اردو ایڈیشن کراچی کے علاوہ مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام لکھنؤ سے شائع ہوا ہے (کتاب کا اردو ایڈیشن حیدرآباد میں ندوہ ایجنسی، ارم کاٹیج، اعظم پورہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے) انگریزی ایڈیشن لکھنؤ ہی میں زیرِ طبع ہے۔

یہ کتاب جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ حد درجہ احتیاط اور توازن کے ساتھ لکھی گئی ہے اور جنگِ جمل اور جنگِ صفین اور حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کی باہمی آویزش کی تصویر اور توجیہہ کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ "عظمتِ صحابہؓ کی رسی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پائی ہے اور قرآنی فرمان:۔ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا وعدہ سب (صحابہؓ) سے کر رکھا ہے) اور "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے) کی تشریح و تعبیر پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ مصنف نے ایک جگہ حضرت معاویہؓ کے اوصاف و کمالات اور ان کے متعدد کارناموں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ: "ان سب کے ساتھ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ خلافت کے معاملے میں حق حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے ساتھ تھا" (صفحہ ۳۲۳) اس سے ان کے منصفانہ اور حقیقت پسندانہ ذہن و مزاج کا اندازہ ہوتا ہے، جس کی اس زمانہ میں بڑی کمی ہے اور اس کمی ہی نے حق و دیانت اور الفت و محبت کی بساط الٹ کر رکھ دی ہے۔ اسی صورتِ حال سے متاثر ہو کر جگر مرادآبادی نے کہا تھا۔ ؎

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگرؔ ؛ آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

مگر مولانا علی میاں جیسے صاحبِ قلم کی قلم و میں عدل و انصاف اور حق و دیانت کی روشنی جب جگمگاتی نظر آتی ہے تو شکیل بدایونی کو یہ کہنے کی ہمت ہوتی ہے۔ ؎

لاکھ دستورِ وفا دنیا سے اٹھتا جائے ہے ؛ آج بھی لیکن کوئی انساں نظر آ جائے ہے

بہرحال اس کتاب کے بعد خلفائے اربعہ کی سیر پر اب اردو میں چار معتبر اور مستند کتابیں الگ الگ سامنے آگئیں۔ مولانا علی میاں نے آخری خلیفہ پر لکھی گئی اپنی اس کتاب کا نام "المرتضیٰ" رکھا، جب کہ اس سے پہلے مولانا شبلی نعمانیؒ نے دوسرے خلیفہ کی سیرت "الفاروق" کے نام سے مرتب فرمائی، خلفائے اربعہؓ کے خطاب والقاب کے اعتبار سے کتابوں کے نام میں بڑی موزونیت، معنویت اور یکسانیت رہے گی، اگر مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کی دونوں کتابوں کا نام "صدیق اکبر" اور "عثمان ذی النورین" کے بجائے "الصدّیق" اور "الغنی" ہوتا، اس طرح خلفائے اربعہ پر ایک تحقیقی سیٹ "الصدّیق، الفاروق، الغنی اور المرتضیٰ" کے نام سے تیار ہوجاتا۔

اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیاتِ طیبہ ہمیشہ سے اسلام دشمنوں کی زبان وقلم کا ہدف رہا کئے ہیں۔ صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد مغربی اور عیسائی ممالک نے اس کو اپنی مستقل مہم بنالیا ہے اور علم وتحقیق اور ادب کے نام پر اس مقصد کے لئے وہ کچھ کیا جاتا ہے جو علمی دیانت کے یکسر مغایر ہے۔ وہ اعتراضات اور شبہات جن کا بار بار جواب دیا جاچکا ہے، جو اپنے اندر کوئی استدلالی قوت نہیں رکھتے، انہیں کو بار بار دہرایا جاتا ہے، حد یہ ہے کہ بعض خدا ناترسوں نے اب اسی مضمون کو ناول اور افسانوں کا پلاٹ بنانا شروع کردیا ہے۔ اسی طرح کی حرکت ایک ہندوستان نژاد اور رشد وہدایت سے محروم، سلمان رشدی نے اپنی نئی کتاب "شیطانی آیات" میں کی ہے، جو دراصل مصنف کے "شیطانی خیالات" کا مجموعہ ہے، اور واقعہ ہے کہ اس طرح کے افکار وخیالات کے مجموعہ کے لئے اس سے زیادہ کوئی اور نام موزوں نہ ہوگا، اس کتاب میں پیغمبر اسلامؐ کو "مہادند" (نعوذ باللہ) اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو "چمچہ" (والعیاذ باللہ) سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس تحریر پر نہ صرف مسلمان، بلکہ ہر معقول آدمی کی برہمی اور ناپسندیدگی ایک طبعی امر ہے، چنانچہ پوری دنیا میں اس تحریر کے خلاف سخت احتجاج ہوا ہے۔ حکومتِ برطانیہ نے ۔ جو صلیبی فکر کی قدیم نمائندہ ہے۔ اس کتاب پر انعام کا اعلان بھی کیا تھا، مگر معلوم ہوا ہے کہ اب یہ انعام روک دیا گیا ہے، برطانیہ میں بھی خود اس کے خلاف سخت احتجاج ہو رہا ہے، مصنف کو اپنی جان کے لئے بھی اب خطرہ محسوس ہو رہا ہے اس کے لئے باضابطہ حکومت کی طرف سے محافظین رکھ دئے گئے ہیں، اور اب مصنف امریکہ کو راہ فرار اختیار

کرنے کے درپے ہے ــــــ تاہم یقین ہے کہ جو شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے گا، اس کے لئے دنیا میں سکون مقدر ہے اور نہ آخرت میں، اگر مسلمانوں کی غیرت اور دینی حمیت بیدار ہے اور وہ احساس وشعور کا ثبوت دیں تو اس قسم کے افسوسناک اور شرمناک واقعات کا دفعیہ چنداں دشوار نہیں۔

"صفا" کا یہ شمارہ بھی بحمداللہ تنوع مضامین سے آراستہ ہے، فقہی سوالات اور اس کے جواب بھی ہیں، صحاح ستہ کے تعارف اور ان کی خصوصیات و امتیازات، نیز ازروئے درایت حدیث کی پرکھ اور نقد پر بھی دو اہم تحریریں شریکِ اشاعت ہیں، انکارِ حدیث کی رد میں بھی ایک مقالہ سے قارئین استفادہ کر سکیں گے۔ "صفا" کے ہر شمارہ میں کسی ایک اہم جدید فقہی مسئلہ پر بحث کی جاتی ہے، اب تک حقوق کی خرید و فروخت، نوٹوں اور سکوں کی فقہی حیثیت، نیز اعضاء کی پیوندکاری پر مضامین شائع ہو چکے ہیں، اس شمارہ میں ایک وقیع، جامع اور عالمانہ تحریر "ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید" اور اس سے متعلق احکام پر مشتمل ہے جو امید ہے کہ توجہ کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ ادبیات پر دو اہم مضامین ہیں، ایک اردو زبان میں تذکرہ نگاری کے موضوع پر، دوسرے علامہ اقبال کے ایک شعر کی تشریح۔ شخصیات میں "علامہ ابن تیمیہ" پر ایک مقالہ بھی آپ پڑھ سکیں گے ــــــ انشاءاللہ "صفا" کے آئندہ شمارہ سے جب کہ اس کی نئی جلد کا آغاز ہوگا، دفعہ وار اسلامی قانون اور معروف اسلامی کتب کا تعارف وغیرہ کا سلسلہ شروع کیا جائے گا، ہمیں اس سلسلہ میں اپنے باذوق قارئین کے قیمتی مشوروں کا بھی انتظار رہیگا۔

محمد رضوان القاسمی

۲۵ ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ

مطابق ۶ دسمبر ۱۹۸۸ء

انتخاب

مفکرِ اسلام
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شعور کی تربیت

عالمِ اسلام کی ایک بہت بڑی ضرورت

کسی قوم کے لئے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ صحیح شعور سے خالی ہو، ایک ایسی قوم جو ہر طرح کی صلاحیتیں رکھتی ہو اور دینی و دُنیاوی دولتوں سے مالا مال ہو لیکن اس کو نیک و بد کی تمیز نہ ہو، وہ اپنے دوست و دشمن کو نہ پہچانتی ہو، پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی اس میں صلاحیت نہ ہو اپنے رہنماؤں اور قائدین کا احتساب کرنے کی اور قومی مجرموں کو سزا دینے کی اس میں جرأت نہ ہو، وہ خود غرض رہنماؤں کی چرب زبانی و شیریں کلامی سے مسحور ہو جاتی ہو اور ہر مرتبہ نیا دھوکا کھانے کے لئے تیار رہتی ہو، وہ قوم اپنی تمام دینی ترقیات اور دُنیاوی سرفرازیوں کے ساتھ قابلِ اعتماد نہیں، وہ پیشہ ور اور خود غرض رہنماؤں اور منافق قائدین کا کھلونا بن جاتی ہے، ان کو قوم کی سادہ لوحی اور بے شعوری کی بناؔ پر من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع ملتا ہے اور ان کو اس کا اطمینان ہوتا ہے کہ کبھی ان کا محاسبہ اور ان سے بازپرس نہیں کی جائے گی۔

مُسلم ممالک کے متعلق اگر ہم یہ کہنے سے احتیاط کریں کہ وہ بیداری اور شعور سے بالکل محروم ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ ان کا شعور بہت کمزور ہے اور وہ بیداری کی ابتدائی منزل میں ہیں، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خیر خواہ اور بدخواہ کے ساتھ ان کا معاملہ تقریباً یکساں ہے، بلکہ بعض اوقات بدخواہ اور غیر مخلص اشخاص مسلمانوں میں زیادہ ہر دلعزیز اور معتمد بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "مومن سانپ کے ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا" لیکن مسلمان ممالک کے باشندے ہزار ہزار بار ڈسے جانے کے لئے تیار رہتے ہیں، ان کا حافظہ نہایت کمزور ہے وہ اپنے قائدین اور رہنماؤں

کے ماضی کو اور ماضی قریب کے واقعات کو فوراً بھول جاتے ہیں، ان کا دینی اور شہری شعور کمزور اور سیاسی شعور تقریباً ناپید ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ غالب قوموں اور خود غرض رہنماؤں کا بازیچۂ اطفال بنے ہوئے ہیں اور آسانی کے ساتھ ان کا رُخ ہر طرف موڑا جا سکتا ہے، حکومتیں ان کی مرضی کے خلاف فیصلے کرتی رہتی ہیں اور جس طرف چاہتی ہیں ایک لاٹھی سے ہانک لے جاتی ہیں۔

مغربی قومیں اپنے روحانی اور اخلاقی افلاس اور ان تمام خرابیوں کے باوجود جن کی تشریح ہم نے اس مضمون میں کی ہے، شہری اور سیاسی شعور کی مالک ہیں وہ سیاسی بلوغ کو پہنچ چکی ہیں وہ اپنے نفع و نقصان کو پہچانتی ہیں وہ مخلص و منافق، اہل و نااہل کے فرق کو جانتی ہیں، وہ اپنی قیادت ایسوں کے سپرد نہیں کرتیں جو نااہل ضعیف اور خائن ہیں، وہ جب اپنے معاملات کسی کے سپرد کرتی ہیں تو ڈرتے ہوئے اور احتیاط کے ساتھ، اور جس مرحلہ پر بھی ان کی نااہلی یا خیانت کا اظہار ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھتی ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کر چکے اور ان کا کام ختم ہو گیا تو ان کو وہ اپنے منصب سے سبکدوش کر دیتی ہیں، اور ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتی ہیں جو ان سے زیادہ اہلیت کے مالک اور موقع کے مناسب ہوتے ہیں اس موقع پر کسی رہنما یا معتمد کی سابقہ خدمات، شاندار ماضی اور کسی معرکہ میں نمایاں کامیابی اس قومی فیصلہ میں حائل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں سیاسی پیشہ وروں اور نااہل اور خائن رہنماؤں سے محفوظ ہیں، ان کے سیاسی رہنما اور ان کے نمائندے بھی محتاط اور امانت دار بننے پر مجبور ہیں، وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں قوم کی سرزنش عوام کے عتاب و احتساب اور رائے عامہ کی قہرناکی سے وہ لرزہ براندام رہتے ہیں۔

عالم اسلام کی ایک بہت بڑی ضرورت اور اس کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ اُمت کے مختلف طبقات اور عوام میں صحیح شعور پیدا کیا جائے اور جمہور کی عقلی مدنی اور سیاسی تربیت کی جائے، یاد رہے کہ تعلیم کی اشاعت اور تعلیم یافتہ اشخاص کی کثرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قوم میں شعور بھی موجود ہے اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کے عموم اور علوم کی اشاعت سے شعور کے بیدار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، لیکن شعور بیدا کرنے کے لئے بہر حال مستقل جد و جہد کی ضرورت ہے، مسلمان رہنماؤں اور مسلمانوں میں اصلاحی کام کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جس قوم میں غور کی کمی ہے وہ قوم اعتماد کے لائق نہیں، خواہ اس کو اپنے قائدین پر کتنا ہی اعتماد ہو اور وہ ان کی پیروی اور اطاعت میں کیسی ہی چستی اور

سرگرمی دکھائے اور ان کی دعوت پر کتنی ہی عظیم قربانیاں پیش کرے اس لئے کہ جب تک اس کا شعور تیار نہیں اور وہ بالغ نظر اور پختہ خیال نہیں ہوئی ہر آن اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی دوسری دعوت اور تحریک کا آلہ کار بن جائے گی اور آن کی آن میں سالہا سال کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔ جس قوم کا شعور بیدار نہیں ہوا اور جس میں خود سوچنے اور اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پر میدان میں پڑا ہو، اور مختلف سمت کی ہوائیں اس کو اِدھر سے اُدھر اڑاتی پھرتی ہوں۔

اسلام اگرچہ ایک آسمانی مذہب ہے اور اس کی بنیاد وحی و نبوت پر ہے، لیکن اس نے بھی اپنے پیروؤں میں ایک خاص شعور پیدا کیا جو شعور کی تمام اقسام میں زیادہ مکمل زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ گہرا ہے اس نے اپنے ماننے والوں میں ایک خاص قسم کا طریق فکر پیدا کیا جو جاہلی طریق فکر سے بالکل مختلف ہے اس نے اپنے ماننے والوں کو ایک بیدار اور خود دار شعور عطا کیا جو اپنی وسعت اور قدرتی لچک کے باوجود ان افکار و نظریات کو انگیز نہیں کر سکتا جو اس کے مسلمات سے جوڑ نہ کھاتے ہوں اور نہ ان عناصر و اجزا کو ہضم کرنے کے لئے تیار ہے جو اس کی روح اور اس کے اصول سے تضاد رکھتے ہیں۔

اس لئے عالم اسلام کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں صحیح شعور پیدا کیا جائے، ایسا شعور جو نہ کسی ظلم و ناانصافی کو برداشت کر سکے، نہ دین و اخلاق سے انحراف کو، جو صحیح اور غلط، خلوص اور نفاق، دوست اور دشمن اور مصلح اور مفسد کے درمیان آسانی سے تمیز کر سکے، مجرم اس کی ناراضگی اور عتاب سے بچ نہ سکیں، اور مخلص اس کے اعتراف اور قدر شناسی سے محروم نہ رہیں، وہ اپنے تمدنی، سیاسی، اجتماعی اور دینی مسائل و معاملات میں ایک عاقل و بالغ انسان کی طرح غور کر سکنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جب تک یہ شعور نہ پیدا ہو، کسی اسلامی ملک و قوم کا جوش عمل صلاحیت کار دینی جذبات اور مذہبی زندگی کے مظاہر و مناظر کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

عصرِ حاضر کے ایک مغالطہ کا عقلی جائزہ

مولانا بدر الحسن القاسمی (کویت)

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اسلامی قانون سازی میں بنیادی اور ناقابلِ انکار ہے خداوند قدوس کے فرمان (قرآن حکیم) کی تشریح اسی کے ذریعہ ہوتی ہے، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی اسوہ اور زبانی احادیث کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسلامی قانون کی ذیلی دفعات تو الگ رہیں بنیادی عبادات نماز، روزے تک کے احکام ناقابل عمل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نماز کا حکم تو قرآن میں آیا ہے لیکن کس طرح اور کتنے وقت نماز ادا کی جائے اس کی وضاحت حدیثِ رسول اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی اسوے سے ہی ہوتی ہے، اسی لئے اصول کی کتابوں میں حدیثِ رسول کو قرآن حکیم کے بعد دوسرا تشریعی ماخذ یا اسلامی قانون کی دوسری بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ایک زکوٰۃ ہی کی مثال لے لیجئے اس کی فرضیت تو قرآن سے ثابت ہے لیکن کس مال میں کتنی زکوٰۃ واجب ہوگی؟ اور کتنی مدت کے بعد؟ اس کا بیان حدیث سے معلوم ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ قرآن پہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود حدیثِ رسولؐ کا انکار کرتے ہیں لیکن غور سے دیکھیں تو اُن کے دعویٰ ایمان اور انکار حدیث میں آپ تضاد محسوس کریں گے۔

ایمانیات کی سب سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ اس کائنات کے لئے ایک خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رسول اور قرآنِ حکیم کو خدا کی کتاب مانی جائے، ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کا علم کہ "قرآن کریم" خدا کی کتاب ہے اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہم رسول اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد (حدیث) کو صحیح مانیں کہ "قرآن خدا کی کتاب" ہے، بغیر آپؐ کے اس ارشاد گرامی یا دوسرے لفظوں میں دعویٰ وحی و نبوت جس کا اظہار آپ نے زبان مبارک ہی سے فرمایا ہے اور جس کو آپؐ کا فرمان یا دوسرے لفظوں میں "حدیثِ رسولؐ" کہا جا سکتا ہے، پر ایمان لائے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اس لئے انکار حدیث کے ساتھ قرآن پہ ایمان کا دعویٰ بے معنی ہو جاتا ہے چاہے بولنے والے کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو اور ہر مسلمان کم از کم آپؐ کے اس ارشاد پر ضرور ایمان رکھتا ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمان ہی نہیں رہ سکتا۔

بعض تجدد پسندوں یا "روشن خیالوں" نے حدیثِ رسولؐ سے جان چھڑانے کی دوسری راہ اختیار کی ہے، وہ صاف انکارِ حدیث کی جرأت تو اپنے اندر نہیں پاتے لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق ایک حدیث وہ ہے جس کو متواتر کہتے ہیں اور جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کو نقل کرنیوالے ہر زمانہ میں اتنے ہوں کہ جس کے بارے میں جھوٹ کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا ہے اور دوسری حدیث وہ ہوتی ہے جو اصطلاحی طور پہ "خبرِ واحد" کہلاتی ہے جس کو روایت کرنیوالے کسی نہ کسی طبقے میں ایک ایک ہی رہ جاتے ہوں پہلی قسم کی حدیث تو ایسی ہے کہ جن کو ماننا ضروری ہے اور دوسری قسم کی حدیث کو عمومی قانون سازی کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا اور پھر وہ لوگ اپنے اس مفروضہ تخیل کو دین کی بہت سی بنیادی باتوں کے انکار کا وسیلہ بنا لیتے ہیں اور یہ کہکر انکی بے وقعتی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ تو "خبرِ واحد" سے ثابت ہے جس کو ماننا ضروری نہیں ہے۔ اس طرح کے لوگ خود بھی اور ان کے مخاطب بھی ایک بنیادی مغالطہ کا شکار ہوتے ہیں اور اسی کی وضاحت اس مضمون کا موضوع ہے

اس میں شک نہیں کہ حدیث کی کتابوں میں محفوظ روایتوں کا بیشتر ذخیرہ محدثین کی اصطلاح کیمطابق "خبرِ واحد" کی حیثیت رکھتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں اگر مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو دین کے بنیادی مسائل، فنی اصطلاحوں سے ہٹ کر ہم تک خالص یقینی اور متواتر ذرائع سے پہنچتے ہیں اور وہ ذرائع ایسے ہیں کہ اصطلاحی تواتر کے مقابلہ میں زیادہ یقین افزا اور قابلِ وثوق ہیں۔

نماز کے اوقات، نماز پڑھنے کی کیفیات، مال کی مختلف اقسام میں زکوٰۃ کے نصاب بلکہ ایک اذان ہی کے مسئلہ پر اگر آپ غور کیجئے تو آپکا دل شہادت دیگا کہ یہ صحیح ہے کہ اذان سے متعلق جتنی روایتیں بخاری شریف، مسلم شریف اور حدیث کی دوسری کتابوں میں آئی ہیں وہ سب اصطلاحی تقسیم کے مطابق خبرِ واحد ہیں۔ لیکن دوسری طرف چودہ سو سال میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا کہ اذان کے بغیر ہی نماز پڑھنے پہ مسلمانوں نے اتفاق کرلیا ہو، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے لیکر آجتک اذان کی آواز ہر شہر اور ہر گاؤں میں گونجتی آئی ہے۔

اسی طرح نماز کے اوقات فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اور زکوٰۃ کے متعین شدہ نصاب کے مطابق ادائیگی کے بارے میں مسلمانوں کا عمل کبھی اور دنیا کے کسی خطہ میں نہیں بدلا، صدیوں تک عملی طور پہ پوری امت کا کسی عمل کی پابندی کرتے آنے سے بڑھ کر کسی چیز کے ثبوت کا باوثوق ذریعہ تو اصطلاحی "خبرِ متواتر"

کو بھی نہیں قرار دیا جاسکتا اس لئے یہ محض مغالطہ ہے کہ ہم کسی حدیث کو حدیث کی کسی کتاب میں خبر واحد پاکر اس سے پہلو تہی کی کوشش شروع کردیں اور امت کے مسلسل عمل کو نظر انداز کردیں۔

قرآن کریم خداوند قدوس کی نازل کردہ کتاب ہے اس کا ہر ہر لفظ اسی طرح ہے جس طرح کہ خدا نے حضرت جبریل امین کے ذریعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہ نازل کیا ہے اور ہم تک محفوظ شکل میں اس کے پہنچنے کا محدثین کے اصطلاحی تواتر اسناد سے زیادہ قوی تر اور یقینی ذریعہ پوری امت کا اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے طبقہ بہ طبقہ نقل کرتے آنا ہے، اگر سند کے اصطلاحی تواتر پہ مشتمل وثائق نہ بھی رہیں تو قرآن کی صداقت اور اس کے خدا کی کتاب ہونے پہ کوئی حرف اس لئے نہیں آئے گا کہ اس کا ایک ایک لفظ اور ہر لفظ کی ادائیگی کی کیفیت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے برابر اور نہایت احتیاط کے ساتھ منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔

ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں جن باتوں پہ یقین رکھتے ہیں ان میں سے بیشتر ایسی ہی ہیں کہ اگر ہم سے یہ معلوم کیا جائے کہ ان کے بیان کرنیوالے کون کون ہیں اور کس نے کس سے سُنا تو یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں ہوگی کہ ہم اصطلاحی سند اس کی ذکر کرسکیں لیکن ہمیں اس کے ہونے کا پورا یقین ہے، ہم حاتم کی سخاوت کو بطور محاورہ ذکر کرتے ہیں لیکن اس کی کوئی اصطلاحی سند ہمارے پاس نہیں ہے، ہم میں سے جس نے امریکہ، لندن، اور دوسرے دُور دراز کے شہروں کو نہیں دیکھا اسے بھی ان کے ہونے کا پورا یقین ہے حالانکہ یہ باتیں سُنی سنائی ہی ہوتی ہیں اور کس نے دیکھ کر کس کے سامنے اپنا مشاہدہ بیان کیا اس کی کوئی محفوظ سند یا اصطلاحی ثبوت نہیں ہوتا لیکن ہم اُسے بے چون وچرا تسلیم کرتے ہیں اور اس کی اساس پہ بڑے بڑے اقدامات کرگذرتے ہیں، ——— یہی نہیں بلکہ بعض چیزوں میں ہم ان خبروں کو بھی متواتر سے زیادہ یقینی تصوّر کرتے ہیں جن کی حیثیت "خبر واحد" سے بھی کمتر ہوتی ہے، ہم میں سے ہر شخص کو ساری زندگی یہ غیر متزلزل یقین ہوتا ہے کہ وہ فلاں شخص کا بیٹا ہے جبکہ اس کی تمامتر بنیاد صرف ایک عورت (ماں) کی خبر پہ ہوتی ہے۔

اسی لئے ابن حزم ظاہری اور علامہ بزدوی وغیرہ نے بہت صحیح تجزیہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:-

جو شخص خبر واحد پہ بالکل یقین نہ رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو درحقیقت اس نے (لم یعرف دینہ ودُنیاہ ولا امّہ واباہ) نہ تو اپنے دین اور دنیا کو سمجھا اور نہ اپنے ماں اور باپ کو پہچانا۔ یعنی اپنی نسبت

کسی متعین شخص کی طرف باپ ہونے کی حیثیت سے کرنے میں تو اسے یہ بالکل یاد نہیں رہتا کہ اس خبر کی حیثیت خبرِ واحد کی ہے اور وہ بھی محض ایک عورت کی شہادت پہ اسکی بنیاد ہے لیکن جب اسی کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پہ ایمان کا مسئلہ آتا ہے تو فوراً اسے یہ وسوسہ ہونے لگتا ہے کہ خبر واحد سے تو یقین کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ نفس کا فریب اور ایسا مغالطہ ہے جس کا عام لوگوں کو تو احساس بھی نہیں ہوتا اور وہ لوگ جو "روشن خیالی" کے عنوان سے لوگوں کے دلوں میں دینی اور اعتقادی امور میں شبہ پیدا کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں انہیں لوگوں کی سادہ لوحی سے اس کا موقع مل جاتا ہے کہ وہ جس چیز کے بارے میں چاہیں غیر یقینی ہونے کا اعلان کریں اور جس چیز پہ چاہیں لوگوں کے ایمان ویقین کو متزلزل کردیں۔

اس لئے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہونی چاہیے کہ "خبر واحد" کے ظنی اور یقینی ہونے کی بحث جو فقہاء نے کی ہے اس کا ایک خاص اصطلاحی مفہوم ہے جس کا ادراک عام لوگوں کو آسانی سے نہیں ہو سکتا، دوسری طرف یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے عیاں ہے کہ ہم اپنے دن رات کے عمل اور روزمرّہ کے کاموں میں عام طور پہ اسی کو یقین کا وسیلہ بنائے ہوئے ہیں جس کو اصطلاحی طور پہ خبر واحد کہا جاتا ہے پھر سب سے اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ دین کے مسلّمات اور ایسے امور جن کا ہمارے اعتقادی یا عملی زندگی سے تعلق ہے وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی سے لیکر آجتک طبقہ بہ طبقہ منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں اور ایسی باتیں جن کی مشاہدہ کرنیوالی پوری امّت ہو اور اس کو ایک گروہ سے دوسرے گروہ تک منتقل کرنے میں کبھی خلل نہ پیدا ہوا ہو وہ یقین پیدا کرنے میں اصطلاحی "تواتر" سے زیادہ وزن اور اہمیّت رکھتی ہیں ۔ خدا ہم سب کے ایمان میں پختگی اور قوت پیدا فرمائے اور ایسی باتوں سے بچائے جو لادینیت اور الحاد کی طرف لے جانیوالی ہیں۔

صحاح ستہ پر ایک نظر

مولانا سید حسنین احمد ندوی
فاضلِ دیوبند

کتابتِ حدیث کا کام حضورؐ کی زندگی میں ہی شروع ہو چکا تھا اور مختلف صحابی رسولؐ ذاتی طور پر ان احادیث کو قلمبند کر لیا کرتے تھے جو وہ حضورؐ سے سنا کرتے تھے، چنانچہ سعد بن عبادہ انصاریؓ کے پاس مکتوبہ احادیث کا ایک مجموعہ موجود تھا جس سے وہ روایتیں بیان کیا کرتے تھے [۱]

اسی طرح سمرۃ بن جندبؓ کے پاس بھی اسی قسم کا ایک نسخہ موجود تھا جس میں بہت سی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں [۲]۔ جابر بن عبداللہ کے پاس بھی ایسا ہی ایک مجموعہ تھا جس کے بارے میں امام مسلم کا خیال ہے کہ وہ مناسکِ حج سے متعلق تھا لیکن عہد نبویؐ کے مجموعہ احادیث میں سب سے زیادہ شہرت اس مجموعہ کو حاصل ہوئی جسے عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ [۳] نے "الصحیفۃ الصادقہ" کے نام سے مرتب کیا تھا اور جس میں ابن اثیر کے قول کے مطابق ایک ہزار حدیثیں موجود تھیں [۴]۔ اسی طرح "الصحیفۃ الصحیحۃ" بھی قابل ذکر ہے جسے حضرت ابوہریرۃؓ نے اپنے شاگرد رشید ہمام بن منبہ کے لئے مرتب کیا تھا اور جس میں تقریباً ایک سو پچاس (۱۵۰) حدیثیں تھیں [۵]

البتہ تدوینِ حدیث کا کام باضابطہ طور پر عہد نبوی کے آخر دور سے شروع ہوا اور تیسری صدی ہجری میں شباب کو پہنچا، اس عرصہ میں احادیث کے بیشمار چھوٹے بڑے مجموعے مرتب ہوئے جن میں سے بعض اَب نایاب ہیں جبکہ بعض مخطوطات کی شکل میں ابتک دنیا کے مشہور عالمی کتب خانوں میں محفوظ ہیں، البتہ دستیاب مجموعہ احادیث میں یہ مجموعے کافی مشہور ہیں: صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن السکن، صحیح ابن العوانہ، سنن دارقطنی، السنن الکبریٰ للبیہقی، سنن سعید بن منصور، مستدرک حاکم، المنتقی للقاسم بن اصبغ،

---

۱ ترمذی، کتاب الاحکام، باب الیمین مع الشاہد۔ ۲ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۹۸۔
۳ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۔
۴ اسد الغابۃ ج ۳ ص ۲۳۳۔ ۵ جامع بیان العلم ج ۱ ص ۴۴۔

المختارۃ لضیاء الدین المقدسی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبة، مسند داود الطیالسی مسند الحمیدی، مسند البزاز، مسند ابویعلیٰ الموصلی، مسند عبداللہ بن حمید، مسند احمد بن منیع، مسند ابن جریر، مسند الدارمی، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم، دلائل النبوۃ، کتاب الآثار لابی حنیفہ، الموطا لامام مالک وغیرہ، لیکن کتب حدیث میں جو شہرت وقبول صحاح ستہ کو حاصل ہوا وہ کسی اور کو نہ ہوسکا۔

صحاحِ ستہ

صحاح، صحیح کی جمع ہے، اس کا اطلاق اصطلاحی طور پر ان مجموعہ احادیث پر ہوتا ہے جس میں مصنف نے صرف ان ہی روایات کو درج کیا ہو جو ان کے نزدیک صحیح ہو، اس اعتبار سے اس کا اطلاق صحاح کی کتابوں میں سے صرف بخاری ومسلم پر صادق آتا ہے اور ترمذی، ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ پر صادق نہیں آتا لیکن کثرت استعمال اور ان کتابوں کی بعض منفرد خوبیوں کے باعث جملہ چھ کتابیں صحاح ستہ کے نام سے معروف ہوگئیں۔

علامہ ابوبکر حازمی نے راویوں کو قوتِ حفظ اور صحبتِ شیخ کے حصول کے اعتبار سے پانچ طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱ قوی الضبط کثیر الملازمۃ ۲ قوی الضبط قلیل الملازمۃ، ۳ قلیل الضبط کثیر الملازمۃ، ۴ قلیل الضبط قلیل الملازمۃ، ۵ الضعفاء والمجاھیل۔[1]

جن کا حافظہ قوی ہو اور انہوں نے اپنے شیخ کی صحبت زیادہ حاصل کی، جن کا حافظہ تو قوی ہو لیکن انہوں نے اپنے شیخ کی صحبت زیادہ نہ حاصل کی ہو، جن کا حافظہ کمزور ہو البتہ انہوں نے شیخ کی صحبت زیادہ حاصل کی ہو، حافظہ بھی کم ہو اور شیخ کی صحبت بھی کم ہو، کمزور اور مجہول۔

رواۃ کے ان پانچ طبقوں کی بنیاد پر صحاح ستہ میں شامل کتابوں کے مدارج مقرر کیے گئے اور ابتدا میں صحاح خمسہ کی اصطلاح مشہور ہوئی جس میں بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی اور نسائی شامل تھی، حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر متوفی ۵۰۷ھ پہلے شخص ہیں جنہوں نے "شروط الائمۃ الستۃ" تصنیف کی اور ابن ماجہ کو اس کی حسنِ ترتیب کی بنیاد پر صحاح میں

---

[1] شروط الائمۃ الخمسۃ ص ۴۳۔

شامل کر دیا، اس طرح صحاح خمسہ کی جگہ صحاح ستہ کی اصطلاح مشہور ہوگئی اور اسے غیر معمولی قبول حاصل ہوا اور یہ ہمیشہ اہل علم کی توجہ کا مرکز رہا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحاح ستہ میں موجود تمام حدیثیں صحیح اور مستند ہیں اور صحاح ستہ کے علاوہ کتب حدیث میں مذکور تمام حدیثیں غیر صحیح اور ضعیف ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صحاح ستہ میں خصوصاً بخاری و مسلم کے علاوہ بقیہ چار کتابوں میں بہت سی کمزور اور ضعیف روایتیں موجود ہیں اسی طرح صحاح ستہ کے علاوہ کتب حدیث میں بہت سی صحیح روایتیں بھی موجود ہیں پھر بھی صحاح ستہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ صحیح حدیث کا اچھا خاصہ ذخیرہ اس میں موجود ہے جو دینی معاملات کے لئے کافی ہے۔

صحیح البخاری

اس کتاب کا پورا نام "الصحیح الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ و ایامہ" ہے۔ یہ چار ہزار احادیث پر مشتمل صحیح احادیث کا وہ مستند ذخیرہ ہے جسے محمد بن اسماعیل البخاری (۱۹۴ھ ـــــ ۲۵۶ھ) نے انتہائی تحقیق و تدقیق اور احتیاط کے ساتھ تقریباً چھ لاکھ (۶۰۰۰۰۰) احادیث کے وسیع ذخیرہ سے منتخب کیا ہے، اس کی تالیف سولہ [16] سال کی طویل مدت میں مکمل ہوئی اور احادیث کا وہ بے نظیر شاہکار وجود میں آیا جو عالم انسانیت کے لئے باعث فخر ہے، یہ احادیث نبوی کا وہ سدا بہار پھول ہے جس کی عطر بیزیاں ہر دور میں انسانیت کے مشام جاں کو معطر کرتی رہی ہیں اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ چنانچہ امام نووی نے لکھا کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کتاب اللہ کے بعد بخاری و مسلم سب سے صحیح کتاب ہے، اس میں بھی بخاری مسلم کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور علوم و معارف کا خزینہ ہے [1]، شاہ ولی اللہ دہلوی نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ "بخاری و مسلم کے صحت کے بارے میں محدثین کا اتفاق ہے لہذا اس کی عدم صحت سے متعلق کلام ناقابل اعتبار اور ایک مومن کی شان کے بعید تر ہے [2]۔

امام بخاری نے کسی بھی احادیث کو بخاری میں درج کرنے کے لئے جو شرطیں متعین کیں وہ دیگر تمام محدثین کے مقابلے میں......... انتہائی سخت تھیں، یہی وجہ ہے کہ وہ جمہور امت

---

[1] مقدمہ مسلم ج ۱ ص ۱۴۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۶۔

کے نزدیک متفقہ طور پر صحیح احادیث کا مستند ذخیرہ ہے اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے نام سے معروف ہے، پھر بھی اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ کیا واقعی بخاری میں مذکور تمام حدیثیں صحیح ہیں یا ان میں کوئی حدیث ضعیف وکمزور بھی ہے ———؟ حافظ عبدالقادر القرشی، امام دارقطنی اور امام طحاوی نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے کہ بخاری کی تمام حدیثیں صحیح ہیں، چنانچہ ان حضرات نے بخاری کی مختلف حدیثوں پر کلام کیا ہے اور اسے غیر صحیح قرار دیا ہے، جس کی تعداد تقریباً ۸۰ ٹھہرتی ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ نے شدت سے اس بات کی تردید کی ہے اور دلائل کے ذریعہ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بخاری میں درج تمام حدیثیں صحیح ہیں [1]۔

بخاری کا امتیاز

بخاری صرف صحیح احادیث کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت حدیث کے ایک عظیم انسائیکلوپیڈیا کی ہے جو تفسیر، عقائد، سیر اور فقہی احکام سب کو شامل ہے، امام بخاری کسی بھی حدیث سے مستنبط ہونے والے حکم کو "ترجمۃ الباب" کی صورت میں پہلے ذکر کر دیتے ہیں جس سے آپؒ کی محدثانہ شان کے ساتھ ساتھ فقہی بصیرت اور مسائل کے استنباط کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ علماء کا قول ہے "فقہ البخاری فی تراجمہ" بخاری کا سارا کمال ترجمۃ الباب میں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مقامات پر ترجمۃ الباب اور حدیث کا باہمی ربط وتعلق انتہائی دقیق اور پیچیدہ ہوگیا ہے اور طویل احادیث کو ٹکڑوں کی شکل میں بطور ترجمۃ الباب کے مختلف مقامات پر درج کرنے کی وجہ سے احادیث کے متون منتشر اور پھیل گئے ہیں اور بخاری میں کسی حدیث کو تلاش کرنا انتہائی دشوار ہوگیا ہے، اس کے علاوہ امام بخاری نے احکام کے استنباط کے لئے بعض مقامات پر صحابہ وتابعین کے فتاوی بھی نقل کر دیئے ہیں، پھر بھی بخاری کو اس کی بعض امتیازی خوبیوں کی وجہ سے صحاح ستہ میں باجماع امت پہلا مقام حاصل ہے۔ ———

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۸۴۴۔

شروح و حواشی

بخاری اپنی اہمیت وافادیت اور غیر معمولی مقبولیت کے باعث ہمیشہ علماء وفضلاء اور اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی اور اس سے متعلق کسی بھی خدمت کو باعث سعادت سمجھا گیا اور کثرت سے اس کی شروح وحواشی لکھی گئیں، صاحب کشف الظنون نے ان کی تعداد ۱۰۰ سو لکھی ہے جس میں اہم اور مشہور حسب ذیل ہے:

• اعلام السنن	ابو سلیمان احمد بن محمد ابراہیم بن خطاب	۳۰۸ھ
• شرح الجامع	امام قطب الدین عبدالکریم بن عبدالنور	۷۴۵ھ
• الکوکب الدراری	علامہ شمس الدین محمد بن یوسف	۷۸۶ھ
• فتح الباری	ابو طاہر مجد الدین محمد بن یعقوب	۸۱۶ھ
• فتح الباری	ابو الفضل احمد بن علی بن حجر عسقلانی	۸۵۲ھ
• عمدۃ القاری	علامہ بدر الدین عینی	۸۵۵ھ
• التوشیح علی الجامع الصحیح	حافظ جلال الدین سیوطی	۹۱۱ھ
• ارشاد الساری	شہاب الدین احمد بن محمد الخطیب القسطلانی	۹۲۳ھ
• عون الباری	نواب صدیق حسن خاں	۱۳۰۷ھ
• نور القاری شرح صحیح بخاری	شیخ نور الدین احمد آبادی	۱۱۵۵ھ
• فیض الباری	افادات علامہ انور شاہ کشمیری	۱۳۵۲ھ
• لامع الدراری	افادات مولانا رشید احمد گنگوہی	۱۳۲۳ھ
• حاشیہ	علامہ ابو الحسن نور الدین محمد بن عبدالہادی	
• حاشیہ	مولانا احمد علی سہارنپوری	

صحیح مسلم

صحیح مسلم تقریباً چار ہزار احادیث پر مشتمل حدیث کا وہ مستند ترین ذخیرہ ہے جسے

مسلم بن الحجاج القشیری (۲۰۶ ــــــ ۲۶۱) نے ایسی تین لاکھ روایات میں سے منتخب کیا ہے۔ جسے انہوں نے براہ راست اپنے شیوخ سے سنا، اس کی تالیف تقریباً ۱۵ پندرہ سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی، اس میں شبہ نہیں کہ امام مسلمؒ نے امام بخاریؒ کے مقابلے میں حدیث کے انتخاب میں اپنی شرطیں نرم رکھی ہیں، چنانچہ وہ ان روایات کو بھی لے آئے ہیں جن کا تعلق تیسرے طبقے سے ہے جب کہ امام بخاریؒ اس طبقے کی روایت کو قبول نہیں کرتے، اسی طرح امام مسلمؒ کسی روایت کو قبول کرنے کے لئے راوی اور مروی عنہ کا صرف ہمعصر ہونا کافی سمجھتے ہیں جب کہ امام بخاری ثبوت لقاء کے ساتھ ساتھ ثبوت سماع کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں، اسی طرح امام مسلمؒ نے بعض متکلم فیہ روایت کو بھی اپنی کتاب میں جگہ دی ہے جبکہ امام بخاری نے اسے ترک کر دیا ہے لیکن قبولیت حدیث کے لئے ان نرم شرائط کے اختیار کرنے کے باوجود آپ نے صحیح احادیث کے انتخاب کے لئے کافی جدوجہد کیا اور تحقیق و تنقید کے بعد صرف ان ہی روایات کو مسلم میں درج کیا جس کی صحت پر اس زمانہ کے مشہور محدثین متفق تھے، اس کے علاوہ کتاب کے مکمل ہو جانے کے بعد اسے جرح و تعدیل اور علل حدیث کے مشہور امام ابو ذرعہؒ کی خدمت میں پیش کیا تاکہ روایات کی صحت سے متعلق مزید اطمینان ہو جائے چنانچہ امام ابو ذرعہؒ نے تحقیق کے بعد جن روایات میں بھی ضعف محسوس کیا اس کی نشاندہی کر دی، امام مسلمؒ نے ان روایتوں کو حذف کر دیا۔

صحیح مسلم کی خصوصیّت

صحیح مسلم کی وہ خصوصیت جو اسے دیگر کتب حدیث سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا حسنِ ترتیب ہے، چونکہ امام مسلم کے پیشِ نظر ایک موضوع سے متعلق احادیث کو اس کے تمام طرق صحیحہ کے ساتھ جمع کرنا تھا اس طرح خود بخود احادیث منظم شکل میں مرتب ہوگئیں، یہی وجہ ہے کہ مسلم میں کسی بھی حدیث کو بآسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مسلم کے اس حسنِ ترتیب، تلخیص طرق اور دلکش ضبط متن کا نتیجہ ہے کہ بعض لوگ اسے صحاح ستہ میں اولیت کا مقام عطا کرنے کے لئے مصر ہیں، چنانچہ سلمہ بن قاسم قرطبی، امام ابن حزم ظاہری اور ابو علی نیشاپوری اسے بخاری پر فوقیت دیتے تھے۔ اور جہاں تک بخاری کے بعد کا درجہ ہے تو یہ اسے بالاتفاق حاصل ہے۔

شروح وحواشی

صحیح مسلم کی کثرت سے شروح وحواشی لکھی گئی، ان میں مشہور حسب ذیل ہے :۔

• المفہم فی شرح غریب مسلم	عبد المفاخر بن اسماعیل	۵۱۹ھ
• المعلم بفوائد کتاب مسلم	ابو عبداللہ محمد بن علی مازری	۵۳۶ھ
• المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج	حافظ ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی	۶۷۶ھ
• الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج	علامہ جلال الدین سیوطی	۹۱۱ھ
• المعلم فی شرح صحیح مسلم	شیخ ابویوسف یعقوب الاھوری	۱۰۹۸ھ
• عنایۃ المنعم بشرح صحیح مسلم	شیخ عبداللہ بن محمد اماسی	۱۱۶۷ھ
• فتح الملہم ـــــ علامہ شبیر احمد عثمانی (اسکی تکمیل مولانا تقی عثمانی دار العلوم کراچی کر رہے ہیں)		
• حاشیہ صحیح مسلم	برہان الدین ابراہیم بن محمد الحنبلی	۸۴۱ھ
• حاشیہ بر صحیح مسلم	شیخ ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی	۱۱۳۸ھ

سنن ابوداؤد

سنن ابوداؤد ۴۸۰۰ چار ہزار آٹھ سو احادیث پر مشتمل حدیثوں کا وہ گرانبہا مجموعہ ہے جسے ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی (۲۰۲ ـــــ ۲۷۵) نے تقریباً ۵۰۰۰۰۰ پانچ لاکھ احادیث میں سے منتخب کیا ہے۔ اور اس بات کا التزام کیا ہے کہ کوئی حدیث حسن سے کم درجے کی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حسن سے کم درجہ کی اگر کوئی روایت آئی تو آپنے اس پر کلام کرکے اس کے ضعف کو واضح کر دیا ہے، روایت حدیث کے بارے میں آپ اس قدر محتاط تھے کہ حدیث کا وہ ٹکڑا جسے آپ نے براہ راست اپنے شیخ سے نہیں سنا یا سنا لیکن سمجھ نہ پائے اور دوسرے سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا تو اس طرح کی حدیث نقل کرنے کے بعد آپنے اس ٹکڑے کی صراحت کر دی ہے۔

ابوداؤد میں درج نصف حدیثیں بخاری ومسلم میں موجود ہیں اور نصف میں سے بعض صحیحین

کی شرائط پر پوری اترتی ہیں اور باقی میں سے اکثر روایتیں حسن کے درجہ کی ہیں اور کچھ ضعیف ہیں جن کے ضعف کی جانب امام ابوداؤد نے اشارہ کر دیا ہے، اس طرح بعض کے ضعف کی وجہ سے جس نقص یا خطرہ کا امکان تھا وہ خود بخود ختم ہوگیا۔

ابوداؤد کی خصوصیّت

ابوداؤد کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے کہ اس میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا جائے جن سے کسی بھی فقیہ نے کسی مسئلہ پر استدلال کیا ہے اور اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ ابوداؤد میں صحیح روایتوں کے ساتھ ساتھ حسن اور بعض ضعیف روایتیں بھی آگئی ہیں، البتہ ضعیف روایتوں کی جانب عموماً امام ابوداؤد نے اشارہ کر دیا ہے۔ اس طرح ابوداؤد فقہی مستدلات کا اہم ترین ذخیرہ بن گیا ہے اور ابوداؤد کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث حدیث کی کتابوں میں اسے غیر معمولی شہرت و قبول حاصل ہوا، چنانچہ یحیٰ بن ذکریا بن یحیٰ الساجی کا قول ہے کہ اسلام کی اصل کتاب اللہ ہے اور اس کا ستون ابوداؤد، حافظ ابوبکر الخطیب نے ابوداؤد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ علم دین میں ابوداؤد جیسی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی [۱] امام ابوداؤد اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں کہ میری کتاب میں امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ثوریؒ وغیرہ کے مذاہب کی بنیادیں موجود ہیں۔

شروح وحواشی

ابوداؤد کی مشہور شرحیں حسب ذیل ہیں:۔

- معالم السنن — امام خطابی — ۳۸۸ھ
- شرح سنن ابی داؤد — شیخ محی الدین ذکریا یحیٰ بن شرف نووی — ۶۷۷ھ
- تہذیب السنن — حافظ شمس الدین محمد بن ابی بکر — ۷۵۱ھ
- شرح سنن ابی داؤد — علامہ بدرالدین عینی — ۸۵۵ھ

---

[۱] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۱۔

• مرقاۃ السعود	علامہ جلال الدین سیوطی	۹۱۱ھ
• فتح الودود علیٰ سنن ابی داؤد	علامہ ابوالحسن سندھی	۱۱۳۹ھ
• غایۃ المقصود	شیخ شمس الحق عظیم آبادی	۱۳۲۹ھ
• عون المعبود	شیخ محمد اشرف عظیم آبادی	
• بذل المجہود	مولانا خلیل احمد	
• حاشیۃ التعلق المحمود	مولانا فخر الحسن گنگوہی	

سنن ترمذی:

سنن ترمذی مستند حدیثوں کا وہ بے نظیر مجموعہ ہے جسے محمد بن عیسیٰ الترمذی (۲۰۹ ۲۷۹) نے احادیث کے بڑے ذخیرے سے منتخب کیا اور خراسان، حجاز، مصر اور شام کے مشہور علماء کی تصدیق وتحسین کے بعد شائع کیا، اس میں احادیث کی ترتیب، فقہی احکام کے اعتبار سے رکھی گئی ہے، البتہ اس کے دائرہ کو محدود رکھنے کے بجائے وسیع کر دیا گیا ہے اس طرح کہ اس میں سیر، آداب، تفسیر، عقائد، فتن، احکام اور مناقب جیسے ابواب سے تعلق رکھنے والی حدیثیں بھی آگئیں ہیں جس نے سنن ترمذی کو جامع اور سنن دونوں کی مشترکہ خصوصیات کا حامل بنا دیا ہے۔

ترمذی کی خصوصیات

ترمذی صحاح ستہ میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، اس کی بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جو اسے دیگر کتب حدیث سے ممتاز کرتی ہیں، جیسے اس میں مکرر احادیث کی تعداد بہت کم ہے، اسی طرح امام ترمذی نے ہر حدیث کی سند پر کلام کر کے اس کے درجہ کو بھی واضح کر دیا ہے اور اگر کوئی راوی مشتبہ ہو تو وہ اس کا باضابطہ تعارف کرا دیتے ہیں تاکہ اشتباہ باقی نہ رہے، نیز حسن ترتیب مذاہب، فقہاء اور ان کے دلائل کے ذکر کے اعتبار سے بھی یہ کتاب نہایت عمدہ ہے اور اس میں کسی بھی حدیث کو بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

سنن ترمذی اپنی انفرادیت وافادیت کی وجہ سے ہمیشہ اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی، چنانچہ

"صاحب کشف الظنون" نے اسے صحاحِ ستہ میں تیسرے درجہ پر رکھا ہے یعنی صحیحین کے بعد لیکن چونکہ اس میں مصلوب اور کلبی جیسے مجروح راویوں کی روایتیں موجود ہیں، اس کی وجہ سے جمہور علماء اسے تیسرا درجہ نہیں دیتے، اس طرح صحاح ستہ میں اس کا مقام چوتھا ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ ترمذی میں مصلوب اور کلبی جیسے راویوں کی روایت کے موجود ہونے کی وجہ سے اس کی علمی اہمیت وافادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لئے کہ اس قسم کی روایتیں جہاں بھی آئی ہیں، وہاں امام ترمذی نے اس پر تنبیہ کردی ہے، اس طرح ان روایتوں کی مضرتیں خود بخود دور ہوجاتی ہیں۔

شروح وحواشی

• عارضۃ الاحوذی	حافظ ابوبکر بن العربی	۴۵۶ھ
• شرح ترمذی	شیخ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد	۷۹۵ھ
• شرح ترمذی	شیخ سراج الدین عمر بن رسلان	۸۰۵ھ
• قوت المغتذی	علامہ جلال الدین سیوطی	۹۱۱ھ
• شرح ترمذی	ابوالطیب مدنی	۱۱۰۹ھ
• معارف السنن	علامہ یوسف بنوری	
• تحفۃ الاحوذی	مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری	۱۳۵۳ھ
• الکوکب الدری	افادات مولانا رشید احمد گنگوہی	۱۳۲۳ھ
• العرف الشذی	علامہ انور شاہ کشمیری	۱۳۵۲ھ
• حاشیہ	شیخ ابوالحسن نورالدین	۱۱۳۸ھ

سننِ نسائی

سننِ نسائی صحاح ستہ کی اہم کتابوں میں سے ایک ہے، اس کا اصل نام "المجتنیٰ" یا "المجتبیٰ" ہے جس کے معنی انتخاب کے ہیں، اسے احمد بن شعیب النسائی (۲۱۵ــــــ۳۰۳ھ) نے مرتب کیا ہے، یہ دراصل ان کی تالیف کردہ ضخیم کتاب "السنن الکبیر" کی تخلیص ہے، اس میں صرف صحیح

روایتوں کو جمع کیا ہے، آپؒ نے رجال میں جو شرط لگائی ہے وہ بخاری ومسلم کی شرائط سے بھی زیادہ سخت ہے ——————

سنن نسائی کی خصوصیّت

سنن نسائی بخاری اور مسلم دونوں کی خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اس میں موجود تمام حدیثیں صحیح ہیں جیسا کہ حافظ ابو علی، حاکم اور خطیب نے اس کی تصدیق کی ہے اور علل حدیث اور حسن ترتیب اس پر مستزاد ہے ——————

شروح وحواشی

سنن نسائیؒ بالاتفاق صحاح ستہ میں داخل ہے لیکن اس کے باوجود جو توجہ شروح وتعلیقات کے لکھنے میں صحاح میں شامل دیگر کتابوں پہ دی گئی وہ سنن نسائی پر نہیں دی گئی، یہی وجہ ہے کہ اس کی شرح صرف دو تین لوگوں نے لکھی، وہ بھی تشنہ ہے۔

- زوائد النسائی علی الاربعۃ — ابو حفص سراج عمر بن علی — ۸۰۴ھ
- زہر الربی علی المجتبیٰ — علامہ جلال الدین سیوطی — ۹۱۱ھ
- حاشیہ — شیخ ابو الحسن نور الدین — ۱۱۳۸ھ

——————

سننِ ابن ماجہ

سنن ابن ماجہ ابو عبد اللہ محمد بن یزید القزوینیؒ (۲۰۹ —— ۲۷۳ھ) کی وہ مشہور تالیف ہے جس میں آپ نے تقریباً چار ہزار منتخب احادیث جمع کر دی ہیں اور ابو داؤد کی طرح اس بات کی کوشش کی ہے کہ فقہی احکام سے متعلق احادیث کا مجموعہ مرتب کر دیا جائے، فرق صرف اس قدر ہے کہ ابو داؤد نے روایت کے انتخاب میں صحت کا خاص اہتمام کیا اور صرف انہی حدیثوں کو جمع کیا۔ جو ان کے نزدیک کم از کم حسن درجے کی تھیں اور اگر کوئی ایسی روایت درج کی جس میں ضعف تھا تو اس پر کلام کر کے اس کے ضعف کو واضح کر دیا لیکن سننِ ابن ماجہ میں اس کا اہتمام نہیں ملتا۔ جس کا نتیجہ ہے کہ اس میں نہ صرف ضعیف بلکہ بعض موضوع روایتیں بھی درج ہو گئی ہیں، چنانچہ

حافظ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں :-

"ابن ماجہ اچھی کتاب ہے کاش اس کو چند واہی حدیثیں، جو تعداد میں زیادہ نہیں، خراب نہ کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے صحاح ستہ میں ابن ماجہ کے بجائے مؤطا امام مالک کو داخل کیا ہے"

شروح وحواشی

• شرح سنن ابن ماجہ	حافظ علاء الدین بن قلیج	۷۶۲ھ
• ماتمس الیہ الحاجۃ علیٰ سنن ابن ماجہ	شیخ سراج الدین	۸۰۴ھ
• الدیباجہ	شیخ کمال الدین	۸۰۴ھ
• شرح سنن ابن ماجہ	شیخ ابوالحسن	۱۱۳۸ھ
• حاشیہ	مولانا فخرالحسن گنگوہی	

علماء اور اربابِ افتاء کیلئے قابلِ توجہ!

ٹسٹ ٹیوب سے تولید اور اس سے متعلق احکام

خالد سیف اللہ رحمانی

جدید میڈیکل ترقی نے جو بہت سے فقہی مسائل پیدا کئے ہیں ان میں ایک اہم مسئلہ "ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید" کا ہے، اس ایجاد نے بہت سی قباحتوں کے دروازے بھی کھولے ہیں، دوسری طرف اولاد سے محروم لوگوں کے لئے "شمعِ امید" بھی فروزاں کی ہے، ہمیں اس کی قباحتوں اور مفاسد پر بھی نظر رکھنا ہوگا اور حقیقت پسندی کے ساتھ اس بات کا بھی جائزہ لینا ہوگا کہ اگر اس کی کوئی صورت مباح ہو سکتی ہے تو خواہ مخواہ اس پر حرمت کا حکم لگانے سے بھی گریز کیا جائے۔ پھر اگر کوئی صورت جائز ہو سکتی ہو تو اس سے متعلق فقہی احکام و اثرات کیا ہوں گے؟ ان پر بھی غور کرنا ہوگا۔

اجنبی مرد و عورت کے مادہ کا اختلاط

بنیادی طور پر ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید کی دو شکلیں ہیں: اوّل یہ کہ اجنبی مرد و عورت کے مادۂ منویہ اور بیضۃ المنی کو باہم خلط کر کے تولید عمل میں آئے، چاہے یہ دو اجنبی مادے کسی ٹیوب میں خلط کئے جائیں، یا خود اسی عورت کے رحم میں یا کسی اور عورت کے رحم میں، یا خود اس مرد کی قانونی اور شرعی بیوی کے رحم میں۔ یہ صورت بہرحال ناجائز ہوگی کہ اس کی وجہ سے نسب میں اختلاط ہوتا ہے اور زنا کی ممانعت کی اصل وجہ یہی اختلاطِ نسب ہے۔ اس سلسلہ میں صریح نصوص موجود ہیں، آپؐ نے فرمایا:

لا یحل لامرئ یومن باللہ والیوم الآخر ان یسقی ماءہ زرع غیرہ۔(1)	خدا و آخرت پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کے لئے روا نہیں کہ اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی کو سیراب کرے۔

- اسی اختلاطِ نسب سے حفاظت کے لئے ایک مرد کی زوجیت سے نکلنے کے بعد دوسرے مرد کی زوجیت میں

---

(1) سنن ترمذی۔

جانے کے لئے "عدت" کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

منھا معرفۃ براءۃ رحمھا من ماءہ لئلا تختلط الانساب فان النسب احد مایتشاح بہ ویطلبہ العقلاء وھو من خواص نوع الانسان ومما امتاز بہ من سائر الحیوان[1]۔

عدت کی مصلحتوں میں سے یہ ہے کہ اس کے ذریعہ عورت کے رحم کا شوہر سابق کے مادہ سے خالی ہونا معلوم ہوتا ہے، تاکہ نسب میں اختلاط نہ ہو، اسلئے کہ نسب وہ چیز ہے جس کی خواہش کی جاتی ہے اور عقلاء جس کے طلبگار ہوتے ہیں، جو انسانی خصوصیت ہے اور جس کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے۔

پس اجنبی مرد و عورت کے مادے کے اختلاط کی تمام صورتیں گناہ ہیں اور حکم کے اعتبار سے "زنا" ہیں، البتہ چونکہ حدود (شریعت کی مقررہ سزائیں) معمولی شبہات کی وجہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہیں اور یہاں بھی یہ شبہہ موجود ہے، اس لئے کہ زنا دو اجنبیوں کے درمیان ایک جسمانی فعل، یعنی مباشرت کا نام ہے اور ان صورتوں میں یہ فعل اپنی ظاہری شکل کے ساتھ موجود نہیں۔ دوسرے زنا میں دو اجنبی مرد و عورت ایک دوسرے کے جسم سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں، جب کہ اس مصنوعی عمل کے ذریعہ اس طرح کی لذت حاصل نہیں کی جا سکتی، اسلئے اس عمل کی وجہ سے زنا کی مقررہ شرعی سزا (حد) نافذ نہیں کی جائے گی۔ البتہ چونکہ یہ عمل اپنی روح اور نتائج کے لحاظ سے اسی قدر مضر ہے، جس قدر خود فعلِ زنا، اس لئے قاضی اس پر مناسب تعزیر اور سرزنش کرے گا۔

اگر وہ عورت کسی مرد کی زوجیت میں رہتے ہوئے کسی اور اجنبی کے مادہ سے حاملہ ہو یا صاحب اولاد بنے تو مولود کا نسب اس کے حقیقی شوہر سے ثابت ہوگا، اسلئے کہ ثبوتِ نسب کے باب میں فقہی اصول ہے کہ عورت جس مرد کا "فراش" ہو، اس سے پیدا ہونے والے بچہ کا نسب اسی سے متعلق ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا: "الولد للفراش وللعاھر الحجر"[2] اور بیوی کو اس کے شوہر کا فراش مانا گیا ہے[3] ——— نیز اگر کنواری لڑکی اس طرح ماں بنی، تب بھی بچہ کا نسب صرف اسی عورت سے متعلق ہوگا، اس مرد سے نسب کا کوئی تعلق نہیں ہوگا، جس کے مادۂ منویہ سے استفادہ کیا گیا ہے، جیسا کہ زنا کے نتیجہ میں پیدا ہونے

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲، ص ۱۳۔ (۲) سنن خمسہ عن عمرو بن شعیب، جمع الفوائد ج ۱، ص ۲۳۶۔ (۳) ہدایہ ج ۲ ص ۴۰۴، باب ثبوت النسب۔

والے بچوں کا حکم ہے۔ ہاں اگر کسی اجنبی عورت کی بیضۃ المنی حاصل کی گئی اور کسی مرد کے مادۂ منویہ کے ساتھ ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ آبیدگی کی گئی اور پھر یہ "لقیحہ" اس مرد کی جائز بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا گیا اور اسکی بیوی نے اس کو جنا تو اب اس کی بیوی، بچہ کی ماں قرار پائے گی، کیونکہ قرآن میں ماں اس عورت کو قرار دیا گیا ہے، جو بچوں کو جنے (المجادلہ-۲) اور جب اس مرد کی زوجہ ماں قرار پائی تو چونکہ وہ اسی کی فراش ہے، اسلئے وہ خود اس بچہ کا باپ قرار پائے گا اور "جننے والی ماں" کے شوہر سے بچہ کا نسب ثابت ہوگا۔ رہ گئی وہ عورت جس کا بیضۃ المنی اس کی تخلیق کے لئے حاصل کیا گیا تھا تو اس کی حیثیت ماں کی نہ ہوگی، کیونکہ شریعت میں محض یہ بات ثبوتِ نسب کے لئے کافی نہیں کہ مولود کسی کا جزو بن جائے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں جس مرد یا عورت کا جزو بنا ہو، وہ جائز اور حلال طریقہ پر بنا ہو، یہی وجہ ہے کہ زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا، حالانکہ مولود زانی کا جزو ہوتا ہے اور مدت رضاعت دو سال گزرنے کے بعد عورت کا دودھ پیا جائے تو حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی، اسلئے کہ یہ رضاعت مشروع و جائز طریق پر نہیں ہے، البتہ چونکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک "حرمتِ نکاح" میں غایت درجہ احتیاط برتی گئی ہے اور اسی لئے زنا سے بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، اسلئے ان تمام صورتوں میں مولود کے لئے اس مرد کے خاندان سے بھی حرمت قائم ہوگی جس کا مادۂ منویہ اس کی تخلیق میں استعمال ہوا ہے، اس عورت کے خاندان سے بھی جس نے اس کو جنا ہے اور اس کے لئے زحمتِ ولادت برداشت کی ہے، اور اس عورت کے خاندان سے بھی، جس کے رحم سے اس کے وجود کے لئے بیضۃ المنی حاصل کی گئی ہے۔

زن وشو کے مادے کا اختلاط

دوسری صورت یہ ہے کہ خود شوہر بیوی کے مادۂ حیات کو خلط کرکے تولید عمل میں آئے اسکی بھی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں:

(۱) شوہر کا مادہ انجکشن وغیرہ کے ذریعہ عورت کے رحم تک پہونچا دیا جائے۔

(۲) شوہر و بیوی کے مادے حاصل کئے جائیں اور کسی ٹیوب میں مخصوص مدت تک ان کی پرورش کی جائے، پھر اسی عورت کے رحم میں اس کو منتقل کر دیا جائے۔

(۳) شوہر اور اس کی ایک بیوی کا مادہ حاصل کیا جائے اور اس آمیزے کو اسی شوہر کی دوسری بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جائے، اس لئے کہ اس کی پہلی بیوی زچگی کی متحمل نہ ہو، یا طبی اسباب کی بنا پر تولید کی اہل نہ ہو۔

ان شکلوں میں ایک سوال تو یہ ہے کہ ایسا کرنا کیا محض صاحب اولاد ہونے کے جذبہ کی تسکین کے لئے درست ہوگا؟ دوسرے کیا مولود کا نسب ماں باپ سے ثابت ہوگا؟ تیسرے یہ کہ تیسری صورت میں مولود کی ماں کون ہوگی؟ وہ جس کا بیضۃ المنی حاصل کیا گیا، یا وہ جس نے اس کے لئے زحمتِ ولادت برداشت کی؟

اب پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ کیا ایسا کرنا درست بھی ہوگا؟ ——— جن حضرات نے اس کو نادرست قرار دیا ہے ان کے سامنے تین باتیں ہیں، اوّل یہ کہ مرد کو جلق کے ذریعہ مادہ منویہ نکالنا ہوگا اور جلق کرنا درست نہیں، دوسرے مرد و عورت، یا کم از کم عورت کی بے ستری ہوگی اور شدید مجبوری کے بغیر بے ستری اطباء کے سامنے بھی درست اور جائز نہیں، تیسرے یہ طریقہ ہے، بہر حال خلافِ فطرت اور شریعت کا عام مزاج یہ ہے کہ وہ خلافِ فطرت امور سے منع کرتی ہے۔

جہاں تک جلق کی بات ہے تو یقیناً شریعت نے اس سے منع کیا ہے اور جمہور فقہاء اسے نادرست ہی قرار دیتے ہیں، لیکن جہاں ضرورت دامن گیر ہو وہاں اس کی اجازت بھی دیتے ہیں۔ عبدالرشید طاہر بخاری لکھتے ہیں:-

ولا یحل ھذا الفعل خارج رمضان ان قصد قضاء الشھوۃ وان قصد تسکین الشھوۃ ارجوان لایکون علیہ وبال[1]	یہ فعل (جلق) غیر رمضان میں بھی (رمضان ہی کی طرح) حلال نہ ہوگا، اگر تکمیلِ شہوت کی غرض سے ایسا کیا گیا ہو، لیکن اگر شہوت کی تسکین مقصود ہو تو امید ہے کہ اس پر کوئی وبال نہ ہوگا۔

(۱) خلاصۃ الفتاویٰ، ج ا ص ۲۶۰۔

ہمارے زمانہ میں طبی جانچ اور امتحان کے لئے بھی میرا خیال ہے کہ اس کی اجازت دی جائے گی، اب عرض یہ کرنا ہے کہ اوّل تو صاحبِ اولاد ہونے کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور جیسا کہ میں آگے ذکر کروں گا کہ بسا اوقات یہ جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ عفت وعصمت کے نقطۂ نظر سے "ضرورت" کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ دوسرے فقہاء نے بعض ان امور کو بھی مباح رکھا ہے جو مآل کے اعتبار سے بالکل "جلق" کی طرح ہیں، مثلاً "عزل" یعنی بیوی سے اس طرح جماع کرنا کہ انزال کے وقت عضوِ مخصوص باہر نکال لیا جائے اور عورت کے رحم میں انزال سے بچا جائے، احناف کے یہاں یہ صورت جائز ہے[1]، اور ٹھیک جس طرح جلق میں تسکینِ شہوت کی جاتی ہے اور مادۂ منویہ کو ضائع کر دیا جاتا ہے، اسی طرح "عزل" میں بھی تسکینِ شہوت کے ساتھ مادۂ منویہ کو ضائع کیا جاتا ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ تسکینِ شہوت کے لئے عورت کے جسم سے تلذذ کے بجائے خود اپنے ہاتھ سے لذت اندوز ہوا جاتا ہے، تیسرے جلق کی ممانعت کی اصل حکمت یہ ہے کہ اس طرح انسان "مادۂ حیات" کو نسلِ انسانی کی افزائش کے بجائے بے مقصد استعمال کرتا اور ضائع کر دیتا ہے، اب غور کیجئے کہ اگر اس مصنوعی تولید کے لئے "جلق" کیا جائے، تو جلق کا مقصود ہی بدل جاتا ہے، یہاں جلق جوہرِ حیات کو ضائع کرنے کے لئے نہیں، بلکہ کارگر اور ثمر آور کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے، اسلئے یہ صورت جلق کی ممنوع صورتوں کے ذیل میں آنی ہی نہیں چاہئے۔

دوسری وجہ "شدید مجبوری کے بغیر بے ستری سے گریز" ہے ——— اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک قوی وجہ ہے، جو اس کے منفی پہلو پر پیش کی جا سکتی ہے، مگر غور کیا جائے تو اوّل تو صاحبِ اولاد ہونے کا جذبہ ایک غیر معمولی جذبہ ہوتا ہے، بالخصوص عورتوں کے معاملے میں ولادت سے محرومی اکثر اوقات عورت کو مختلف نسوانی، دماغی، قلبی اور جسمانی امراض کا شکار بنا دیتی ہے، بسا اوقات یہ چیز زوجین کے درمیان سخت نفور اور کشیدگی کا باعث بھی بن جاتی ہے اور بعض اوقات عفت وعصمت پر بھی بن آتی ہے، اس لئے یہ فقہی اصطلاح کے مطابق ہر عورت کے لئے ممکن ہے نہ ہو، لیکن بعض خواتین کے لئے "حاجت"[2] کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، جس کو بعض مواقع سے "ضرورت" ہی کے حکم میں رکھا جاتا ہے[3]

---

(1)

(2) فقہاء کے یہاں احکام کے تین درجات ہیں ضرورت، حاجت اور تحسین، ضرورت وہ احکام ہیں، جو حفاظتِ دین (باقی حاشیہ ص

اب جب ہم فقہی تصریحات دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسی صورتوں میں بھی بے ستری کو گوارا کیا گیا ہے، جو بجائے خود کوئی شدید مرض نہیں، لیکن امکانی طور پر شدید امراض کا باعث بن سکتا ہے، جیسا کہ اولاد سے محرومی بعض شدید امراض کا سبب بن جاتی ہے۔ علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں :۔

وقد روی عن ابی یوسف انہ اذا کان بہ ھزال فاحش وقیل لہ ان الحقنۃ تزیل ما بك من الھزال فلا باس بأن یبدئ ذالك الموضع للمحتقن وھذا صحیح فان الھزال الفاحش نوع مرض تکون آخرہ الدق والسل۔(۱)

امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ جس کو غایت درجہ کمزوری ہو اور اس کو بتایا جائے کہ حقنہ اس کمزوری کا ازالہ کر سکتا ہے تو اس کے لئے مضائقہ نہیں کہ حقنہ کرنے والے کے لئے اس جگہ (پائخانہ کا مقام) کو کھول دے، اور یہ صحیح رائے ہے، کیونکہ سخت کمزوری بھی ایک مرض ہے جس کی انتہا دق اور سل کے امراض پر ہوتی ہے۔

یہ رائے تو قاضی ابو یوسف کی ہے، "قوت مجامعت" فقہاء کے یہاں مقررہ تعریف کے اعتبار سے غالباً "ضرورت" میں داخل نہیں ہے، خود سرخسیؒ نے اس کے ضرورت ہونے سے انکار کیا ہے، لیکن ایک مستقل اور اہم دبستانِ فقہ کے بانی "امام شافعیؒ" کے نزدیک قوتِ مجامعت میں اضافہ کے لئے بھی "حقنہ" کرانا اور حقنہ کرانے والے کے سامنے بے ستر ہونا درست ہے، سرخسیؒ ہی نقل کرتے ہیں :

وحکی عن الشافعی قال، اذا قیل ان الحقنۃ تقویك علی المجامعۃ فلا باس بذالك ایضاً۔(۲)

امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ جب مریض سے کہا جائے کہ حقنہ کی وجہ سے تمہارے اندر قوتِ جماع بڑھے گی تو اس کے لئے حقنہ کرانے میں مضائقہ نہیں ہے

بلکہ "ضرورت" تو کجا، سنّت کی ادائیگی، بلکہ ایسی چیز کے لئے بھی فقہاء نے بعض دفعہ بے ستری کی اجازت دی ہے، جو محض مباح یا محض ایک گونہ مطلوب (مکرمہ) ہے، مردوں کا ختنہ کرنا سنت ہے، لیکن بے ستری

(حاشیہ متعلقہ صفحہ گذشتہ) عقل نفس، مال اور نسل کے لئے بالکل ناگزیر ہوں، حاجت وہ ہیں جو ناگزیر تو نہ ہوں، لیکن ان کی رعایت کی جائے تو سخت مشقت کا سامنا ہو اور تحسین وہ احکام ہیں جو ان امور میں سہولت کے لئے ہوں، اکثر علماء اصول نے اور متاخرین میں شاطبیؒ نے "الموافقات" میں اس پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

(۱) المبسوط، ج ۱۰، ص ۱۵۶۔ (۲) حوالہ سابقہ۔

حرام ہے، اور عورتوں کے لئے ختنہ "مباح"، لیکن فقہاء اس کو بھی دائرۂ ضرورت اور دائرۂ عذر میں لے آئے ہیں اور اس کے لئے بے ستری کی اجازت دیتے ہیں، مشہور فقیہ علاء الدین سمرقندی جن کی "تحفۃ الفقہاء" کو ملک العلماء کاسانی نے اپنی مایۂ ناز تالیف "بدائع الصنائع" کے لئے اصل زمین بنائی ہے، لکھتے ہیں:-

ولا یباح النظر والمس الی ما بین السرۃ والرکبۃ الا فی حالۃ الضرورۃ بان کانت المرأۃ ختانۃ تختن النساء۔[1]

ناف وگھٹنوں کے درمیانی حصہ کو دیکھنا، اور چھونا جائز نہیں، سوائے اس کے کہ ضرورت اس کی متقاضی ہو بایں طور کہ دیکھنے والی عورت ختان ہو جو عورتوں کا ختنہ کرتی ہو۔

موٹاپا نہ "ضرورت" ہے نہ "حاجت" لیکن فقہاء نے یہاں بھی حقنہ کی اجازت دی ہے، صاحبِ خلاصہ کا بیان ہے کہ: "لاباس بالحقنۃ لاجل السمن ھکذا" روی عن ابی یوسفؒ[2]، اور صاحبِ اولاد ہونے کا جذبہ تو ایک فطری جذبہ ہے، فقہاء تو عورت کے اس جذبہ کو بھی ناقابلِ اعتنا نہیں سمجھتے کہ وہ خود کو شوہر کیلئے پرکشش بنانے کی غرض سے موٹاپا بڑھانا چاہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ:-

والمرأۃ اذا کانت تسمن نفسہا لزوجہا لاباس بہ۔[3]

عورت اپنے کو شوہر کے لئے موٹا کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

"ٹسٹ ٹیوب" کی مدد لاولد افراد کے لئے دراصل ایک ذریعۂ علاج ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ فقہاء نے انسانی مسائل کو تین خانوں —— ضرورت، حاجت اور تحسین —— میں تقسیم کیا ہے، اور ممنوعات کو صرف اس وقت جائز رکھا ہے، جب کہ ضرورت یا حاجت اس کی اجازت کا تقاضا کرے، لیکن فقہی جزئیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاج ومعالجہ کے باب میں فقہاء نے ایک گونہ زیادہ وسعت سے کام لیا ہے اور یسر وسہولت کو راہ دی ہے، مثلاً جیسا کہ مذکور ہوا، موٹاپا کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن عالمگیری ہی میں ہے:

وسئل ابو مطیع عن امرأۃ تاکل القبقبۃ

ابو مطیع سے اس عورت کے متعلق دریافت کیا گیا

---

(۱) تحفۃ الفقہاء، ج ۳ ص ۳۳۴۔ (۲) خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۳۶۳۔

(۳) ج ۵، ص ۳۵۶۔

واشباه ذالك تلتمس السمن قال لا باس به مالم تاكل فوق الشبع واذا اكلت فوق الشبع لا يحل لها[1]

جو سیب اور اس طرح کی چیزیں موٹاپے کے لئے کھائے انہوں نے فرمایا: اس میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ آسودگی سے زیادہ نہ کھائے، اگر آسودگی سے زیادہ کھالے تو یہ اس کے لئے حلال و جائز نہیں۔

.. ..

اسلئے اس بے مایہ کا خیال ہے کہ اولاد سے محروم شوہر و بیوی کے لئے اولاد کا حصول ایک ایسا فطری جذبہ اور طبعی داعیہ ہے کہ اس کے لئے شوہر کا مرد طبیب اور عورت کی عورت طبیبہ کے سامنے بے ستری گوارا کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک تیسری بات ہے کہ یہ خلافِ فطرت طریقہ ہے ——— تو یہ ممانعت کی کوئی قوی دلیل نہیں ہے، ایک فطری ضرورت اور تقاضا کی تکمیل کے لئے ایسی غیر فطری صورت اختیار کرنا جس کی ممانعت پر نص وارد نہ ہو جائز ہوگا۔ دواؤں کے ایصال کی اصل راہ منہ اور حلق ہے، لیکن مصلحتاً "حقنہ" کی اجازت ہے، بچہ کی ولادت کی اصل راہ عورت کی شرمگاہ ہے، لیکن ضرورت ہو تو آپریشن کی اجازت ہے، اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ مجبوری کے درجہ میں اس غیر فطری عمل کو برداشت نہ کیا جائے۔ پس لاولد زوجین کے لئے اس مصنوعی طریق پر اولاد کا حاصل کرنا درست ہوگا۔

نلکی زادہ کے ثبوتِ نسب کا مسئلہ

یہاں یہ بات تو ظاہر ہے کہ جس مرد کا مادہ تھا، وہی مولود کا باپ ہوگا، ثبوت نسب کے لئے شوہر کے نطفہ سے بیوی کا حاملہ ہو جانا کافی ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ جسمانی طور پر اس کے ساتھ مباشرت کرے، چونکہ یہ بالکل نئی صورت ہے، اسلئے کتب فقہ میں اس سے متعلق صریح حکم کا دستیاب ہونا بظاہر مشکل ہے، البتہ بعض ایسی جزئیات موجود ہیں جن میں وطی کے بغیر بھی استقرارِ حمل کو ممکن تسلیم کیا گیا ہے اور نسب ثابت کیا گیا ہے:

رجل وطی جاریۃ فی مادون الفرج

کوئی شخص اپنی باندی سے شرمگاہ کے باہر

---

(۱) حوالۂ سابق۔

فانزل فاخذت الجاریۃ ماءہٗ فی شیٔ فاستد خلتہٗ فی فرجہا فعلقت عند ابی حنیفہ ان الولد ولدہٗ وتصیر الجاریۃ ام ولد لہٗ۔[1]

جماع کرے اور اس کو انزال ہو جائے، باندی اس مادۂ منویہ کو کسی چیز میں محفوظ کر لے، پھر اس کو اپنی شرمگاہ میں داخل کر لے اور اسے حمل بھی ٹھہر جائے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ بچہ اسی کا ہوگا اور باندی اس کی "ام ولد" قرار پائے گی۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جس عورت کا "بیضۃ المنی" ہے، اگر اسی کے رحم میں اس کی پرورش بھی ہوئی ہے تو وہی اس کی ماں شمار ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایک عورت کی بیضۃ المنی اس کی سوکن کے رحم میں ڈالی گئی اور اس طرح تولید عمل میں آئی تو بچہ کی ماں کون سمجھی جائے گی؟ —— اس بارے میں اہلِ علم کی رائیں مختلف ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ماں وہ ہوگی جس سے "بیضۃ المنی" حاصل کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ ماں وہ ہوگی جس کے رحم میں پرورش ہوئی اور جس نے جنا ہے، حقیقت یہ ہے کہ دلائل اور حکمتِ شرعی پر نظر کی جائے تو یہ دونوں ہی رائیں اپنی اپنی جگہ معقول ہیں، جس عورت سے "بیضۃ المنی" حاصل کیا گیا ہے، وہ اسلئے کہ اب بچہ کی حیثیت اس کے جزو کی ہوگی اور نسب اور اس کی حرمت کی بنا اصل میں اسی رشتۂ جزئیت پر ہے۔ صاحبِ ہدایہ نے زنا کی وجہ سے "حرمتِ مصاہرت" ثابت ہونے پر بحث کرتے ہوئے اسی نکتہ کو ان الفاظ میں اٹھایا ہے:

ان الوطی سبب الجزئیہ بواسطۃ الولد حتی یضاف الی کل واحد منہا کملا۔

وطی مولود کے واسطہ سے جزئیت کا سبب بنتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولود زوجین میں سے ہر ایک کی طرف پوری طرح منسوب ہوتا ہے۔[2]

پھر ماں کے لئے عربی زبان میں "ام" کی تعبیر بھی اس کے حق میں ہے، "ام" اصل اور جڑ کو کہتے ہیں مذکورہ عورت کا "بیضۃ المنی" چونکہ اس کی تکوین کے لئے اصل اور اساس بنا ہے، تو ضرور ہے کہ اس کو ماں قرار پانا چاہیئے۔ پھر رشتۂ رضاعت سے بھی اس رائے کو تقویت پہونچتی ہے، حرمتِ رضاعت کے ثبوت کیلئے ضروری نہیں کہ بچہ ماں کے پستان سے ہی دودھ پیئے، کسی اور ذریعہ سے دودھ پلا دیا جائے تو یہ بھی رشتۂ رضاعت کیلئے کافی متصور ہوتا ہے، اسی طرح کسی اور طریق سے عورت کا "بیضۃ المنی" مولود کی تکوین میں اپنا کردار

(۱) عالمگیری، ج ۳، ص ۴۳، مطبوعہ، دیوبند۔ (۲) الہدایہ، ج ۲، ص ۲۸۹۔

ادا کرے تو اس کو رشتۂ مادری کے ثبوت کے لئے کافی تسلیم کیا جانا چاہیے۔

جن لوگوں نے اس عورت کو ماں رکھا ہے، جو زحمتِ ولادت برداشت کرے اور جس کے رحم میں بچہ پرورش پائے ان کے لئے سب سے بڑی شہادت قرآن پاک کی یہ تعبیر ہے کہ وہ ماں کو "والدہ" (بچہ جننے والی) کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، پھر رحم میں بچہ اسی عورت کے خون سے پرورش پاتا ہے اور اس طرح اپنے وجود کے اعتبار سے وہ اس عورت کا جزء قرار پاتا ہے، اسلئے حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ خاصا دلچسپ اور قابل فکر ہے۔ راقم سطور کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ فقہاء کے یہاں بعض ایسی نظیریں موجود ہیں کہ ایک ہی بچہ کا نسب دو مردوں سے ثابت کیا گیا ہے، اور دونوں ہی کو اس پر "ولایت" کا حق دیا گیا ہے۔ ملا حداد شارح قدوری لکھتے ہیں:

واذا کانت جاریۃ بین اثنین جاءت بولد فادعیاہ حتی ثبت النسب منھما۔[1]	ایک باندی دو شخصوں کے درمیان مشترک ہو، اس باندی کو ولادت ہو اور دونوں اس کے دعویدار ہوں تو مولود کا نسب دونوں سے ثابت ہوگا۔

ابن نجیم نے "ظہیریہ" کے حوالہ سے اس کو تھوڑے فرق کے ساتھ یوں لکھا ہے:

والجاریۃ بین اثنین اذا جاءت بولد فادعیاہ یثبت النسب من کل واحد منھما ینفرد کل واحد منھما بالتزویج۔[2]	دو شخصوں کے درمیان مشترک باندی کو ولادت ہو اور دونوں اس سے ثبوتِ نسب کا دعویٰ کریں تو مولود کا نسب دونوں سے ثابت ہوگا اور دونوں میں سے ہر ایک کو اس کا نکاح کرنے کی ولایت حاصل ہوگی۔

بس کیا یہ بات مناسب نہ ہوگی کہ تمام احکامِ شرعیہ میں ان دونوں کو اس مولود کے لئے حقیقی ماں کے حکم میں رکھا جائے؟

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم۔

---

(۱) الجوہرۃ النیرہ، ج ۲، ص ۶۔ مطبوعہ دیوبند۔

(۲) البحر الرائق، ج ۳ ص ۱۱۹۔

مولانا زبیر احمد قاسمی
شیخ الحدیث دارالعلوم سبیل السلام

علامہ ابنِ تیمیہؒ کے

اصلاحی اور تجدیدی کارنامے

[یہ مقالہ علامہ ابن تیمیہ پر منعقدہ ایک مذاکرہ زیر اہتمام "جامعہ سلفیہ بنارس" میں پڑھا اور پسند کیا گیا۔ ——— "ادارہ"]

یہ سچ ہے کہ تاریخ اپنے آپکو دہراتی ہے، قوم وملت کی تاریخ پر جن کی نظریں ہیں وہ جانتے ہیں کہ فاران کی چوٹی سے جس دن اسلام کا سراجِ منیر چمکا اسی دن سے کورچشموں کی کوششیں رہیں کہ یہ روشنی پھیلنے نہ پائے چنانچہ ردو انکار اور رکاوٹوں کی وہ تیز آندھیاں چلائی گئیں کہ شرافت وانسانیت بھی شرما کے رہ گئی مگر ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جاسکا

اور دنیا اس روشن چراغ کی ضیا پاشیوں سے جگمگا اٹھی۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً ——— پھر زمانہ کا قدم جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا کورچشموں کی بدباطنی بھی نیا رخ اختیار کرتی رہی، کبھی کھلی بغاوت کے ساتھ اس مینارۂ نور کو غبار آلود بنانے کی کوششیں ہوئیں تو کبھی مخفی عداوت سے کام لیکر اسلام کے اس چشمۂ صافی کو مکدّر کرنے کی سازشیں ہوئیں اور کبھی جہالت وبلادت کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر نورِ ہدایت میں ظلمتوں کی آمیزشیں کی گئیں اور بظاہر ایسا محسوس ہونے لگا کہ خاکم بدہن۔ اب چراغ ہدایت کا دم واپسین ہے لیکن "کارساز ما بفکر کار ما"

جب کارساز حقیقی خود اس کی حفاظت کی ذمہ دار ہوں اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ. اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح بشارت موجود ہو کہ ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راٴس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا تو پھر کیسے ممکن ہوتا کہ کورچشموں اور بدباطنوں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوجاتا۔

چنانچہ تاریخ کی شہادت ہے کہ جب کبھی ایسی صورتحال سامنے آئی تو اللہ کی حفاظت اور اس کے رسولؐ کی بشارت کسی نہ کسی مجدّد دین وملت کے روپ میں جلوہ پیرا ہوئی اور اس نے حق وباطل کے درمیان خط امتیاز کھینچ کر اور راہِ حقیقت کے خس وخاشاک کو دور کر کے شاہد حقیقی کے چہرے کو بے غبار بنایا۔

یہ خلیفۂ راشد کے نقشِ ثانی عمر بن عبدالعزیز، حدیث و فقہ کے امام محمد بن ادریس شافعی، یہ امام غزالی و فخرالدین رازی اور یہ جلال الدین سیوطی اور ملا علی قاری اپنی اپنی صدیوں میں اس سلسلۃ الذہب کی کڑیاں ہیں اور بلاشبہ اسی سلسلے کی ایک روشن کڑی دنیائے اسلام کی وہ عظیم شخصیت بھی ہے جو خوش قسمتی سے اس مقالہ کا موضوع ہے۔ ——— آج پھر تاریخ ایک بار اپنی ماضی کو دہرا رہی ہے۔

اور کہیں سے "قالوا مثل ما قال الاولون" کی پرانی روش کے مطابق صحیح عقائد اور بے غبار خیالات پر علمی رنگ میں جدید تعبیرات کے سہارے حملے ہو رہے ہیں اور حقیقت کے شفاف چہرے پر اشتباہ والتباس کے دبیز پردے ڈالے جا رہے ہیں تو کہیں "نفعل بما فعل المبطلون" کی قدیم راہ پر چل کر طریقِ سنت کی پامالیاں اور بدعات و منکرات کی سرپرستیاں ہو رہی ہیں۔ راہِ حقیقت سے گم گشتگی اور رسومِ جاہلیت سے وابستگی افسوسناک ہی نہیں، شرمناک حد میں داخل ہو چکی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ موجودہ صدی میں تجدیدِ دین کا منصبِ عظیم کس کی قسمت کا ستارہ بنے گا اور یہ شرف و سعادت کس فرد یا جماعت کا مقدر بن چکی ہے ——— لیکن اتنا ضرور محسوس کر رہا ہوں کہ اس ہمہ جہتی فتنہ سامان کے دور میں معارف ابن تیمیہ سے بڑھکر کوئی دوسری چیز اقتضائے حال کے مطابق نہیں۔ اور وقت کی ناگزیر ضرورت ہے کہ ساتویں صدی ہجری کے اس بطلِ جلیل کے روشن کارنامے، امتِ مسلمہ کی رہنمائیوں سے متعلق ان کی وقیع خدمات اور تجدید و اصلاح کی راہوں میں پیش آمدہ تمام مشکلات پر قابو پانے کی بے نظیر ہمت و استقامت سے سبق لیا جائے اور روشنی حاصل کیا جائے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ نہ صرف کتاب و سنت کے صحیح ترجمان اور وسیع النظر قوی الایمان عالمِ دین تھے بلکہ ذہانت و ذکاوت میں بھی بے مثال، قوتِ بیان اور طریقِ استدلال میں بھی امتیازی شان والے تھے، ان میں وہ ساری صلاحیتیں اور خصوصیات بدرجۂ اتم تھیں جو ایک مجددِ وقت اور مصلحِ ملت کے لئے ضروری اور مطلوب ہو سکتی ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ بعض معاصر کی متعصبانہ رائے ان کے متعلق سخت متوحشانہ بھی ہے بلکہ بعض سنجیدہ اور صاف ذہن کے تبصرہ نگار بھی ابن تیمیہ کے بارے میں یہاں تک کہہ گئے کہ "علمہ اکبر من عقلہ"۔ بایں ہمہ مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں۔ اگر ابن تیمیہ کے متعلق لوگوں کی زبانیں بند نہ رہ سکیں اور ان کے عقل و شعور اور نکتہ رس ذہانت و ذکاوت کو نشانہ بنایا گیا بلکہ ذاتیات پر حملے کرتے ہوئے ان کی حیثیتِ عرفی اور شخصیت کو مجروح کیا گیا

تو اس پر حیرت و تعجب کیوں کیا جائے؟

ہاں ہمیں حیرت ہے اور سخت حیرت ہوتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ماضی قریب کے دو تین صاحبِ علم اہلِ قلم کے استثنار کے بعد متقدمین و متاخرین اکابر اور معاصر کی پوری جماعت ابن تیمیہ کو حدیث مجدد کا مصداق ماننے اور بنانے سے خاموش گذر جاتی ہے حالانکہ ان کے تجدیدی اور اصلاحی خدمات کا اعتراف ان کے معاصرین اور پچھلے تمام اکابر اہلِ علم کو ہمیشہ رہا جس کی شہادتوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، میں ان شہادتوں کو یہاں نقل کر کے مقالہ کو طول دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس اعتراف و شہادت کے باوجود ان معاصر و اکابر کے طرز فکر کی کوئی توجیہ میرے لئے ممکن نہیں۔ ان ھٰذا من اعاجیب الزمن۔

حد یہ ہے کہ حجۃ الاسلام فی الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ اپنے ایک مکتوب میں ابن تیمیہ کی شخصیت کو نادر الوجود کہتے ہیں۔ عالم قرآن، حافظ حدیث مانتے ہیں، آثار سلف کے عارف معانی قرآن و حدیث کے ماہر، ذکاوت و ذہانت میں یکتا و بے نظیر، سنت و اہلسنت کی طرف سے دفاع میں فصیح اللسان قرار دیتے ہوئے یہاں تک لکھ جاتے ہیں کہ ان کے مخالفین علمار و فقہار علوم شریعت کی بصیرت اور تفقہ میں ان کے عشر عشیر بھی نہیں تھے، ——————— لیکن یہی شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ ازالۃ الخفار، میں حدیث مجدد پر بحث کرتے ہوئے چھٹی صدی ہجری تک کے تمام مجددین اسلام کے نام گناتے ہوئے ہیچمداں تا حال کہکر خاموشی سے گذر جاتے ہیں۔

جب حقیقتِ حال یہ ہے کہ محدثین اور دیگر علمار نے مجدد اسلام کیلئے جن شرطوں اور جن خصوصیات کو لازم قرار دیا ہے وہ ساری شرطیں ابن تیمیہ میں موجود تھیں۔ وہ علم ظاہری و باطنی کے ساتھ آراستہ بھی تھے، احیار سنت اور محو بدعت کے فدائی بھی، ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں صدی کے اوائل ہر دونوں حصے میں ان کی مجاہدانہ خدمت کا نفع عام بھی ہوا اور ان کی مجتہدانہ شان کا اشتہار تام بھی۔ آپ کے عزائم و ارادے میں جدت و حدت تقلید انہیں محض اجتہاد اُتھی۔ مذہب، علم اور سیاست میں ان کے ذریعہ مفید اور صالح انقلاب بھی آیا۔ اللہ کے راستے میں ان کی جانبازی و سرفروشی قلم و لسان سے بڑھ کر سیف و سنان تک جا پہونچی وغیرہ وغیرہ، ——————— تو اب ان ساری خصوصیات و خدمات کے اعتراف کے باوجود پتہ نہیں کیوں انہیں مجدد اسلام کہنے اور ماننے سے پس و پیش کیا جاتا ہے۔

بعض حضرات مجدد اسلام کے لئے ان کے معاصرین کی شہادت مجددیت کو بھی ایک شرط لازم

سمجھتے ہیں، ممکن ہے ایسی بھی کوئی شہادت تلاش بسیار کے بعد مل جائے لیکن نہ بھی ملے تو اُن کی تجدیدی خدمات اُن کے اصلاحی کارنامے، مذہب و علم اور سیاست میں ان کا لایا ہوا انقلاب ایک مضبوط شہادتِ عادلہ ہے جس سے ہر انصاف پسند کو اس کا حق پہونچتا ہے کہ وہ انہیں ساتویں صدی ہجری کا مجدد اسلام تسلیم کرے اور کھُلا اعلان کرے۔

مجدد اسلام ابن تیمیہ کی اصلاحی کوششوں، تجدیدی کارناموں کا میدان یوں تو بہت وسیع ہے مختلف شعبوں اور گوناگوں پہلوؤں کو محیط ہے لیکن انہیں سمیٹ کر تین اہم اور بنیادی شعبوں کے عنوان سے معنون کیا جاسکتا ہے۔

تجدید دین و مذہب، تنقید علم و فکر، اصلاح سیاستِ مدن، ———— اہل زمانہ کی اختصار پسند طبیعت کے سبب میرے لئے تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ تاہم کوشش کروں گا کہ اشارات و کنایات کی زبان میں مختصر سا خاکہ ضرور سامنے آجائے۔

دین و مذہب جو دراصل عقیدہ و عمل کا ایک مجموعہ ہوتا ہے، مختلف اسباب و عوامل کے تحت ابن تیمیہ کے زمانے میں مسلمانوں کے اندر مشرکانہ عقائد و اعمال کا کچھ ایسا عام رواج ہو چکا تھا کہ دینی حس رکھنے والے اہل علم تڑپ تڑپ جاتے تھے، عقیدہ و عمل کا یہ فساد کس افسوسناک حد تک پہونچ چکا تھا اس کا کچھ اندازہ ان اقتباسات سے ہوسکتا ہے جسے صاحبِ (تاریخِ دعوت و عزیمت) نے علامہ ابن تیمیہ ہی کی تصانیف اور تحریروں سے اخذ کر کے اپنی زبان میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ:

"عوام نہیں خواص تک نے مُردوں کو خدا کا درجہ اور اس زندہ پیر کو جو اس کا جانشیں یا قبر کا مجاور ہوتا، پیغمبر کا مرتبہ دے رکھا تھا، مُردوں سے اپنی کاربرآری اور مشکل کشائی کا مطالبہ کرتے اور زندہ بزرگوں کے قبضہ و اختیار میں تحلیل و تحریم کا مسئلہ ہوتا۔ یہ جسے حلال کر دیں وہی حلال اور جسے حرام کہدیں اُسے حرام سمجھا جاتا۔ گویا لوگوں نے درحقیقت اللہ تعالیٰ کو خدائی کے منصب سے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے مرتبے سے سبکدوش کر دیا تھا۔

یہ مجاور لوگ بے تکلف نذر و نیاز اور قبروں کے چڑھاوے کھاتے، کھلی قبر پرستی کرتے ہوئے صاف صاف قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور کہتے کہ یہی قبر خواص کا قبلہ ہے اور کعبہ تو عوام کا ہے۔ خدا سے بے خوف اور نڈر ہوتے لیکن صاحبِ قبر کی خوف و خشیت کا یہ عالم ہوتا کہ بے تکلف کبائر و منہیات کا ارتکاب کرتے ہوئے خدا کا تو ذرا لحاظ نہیں ہوتا لیکن بزرگ کے مزار کا گنبد دیکھ لیتے تو سہم کر فوراً اس

بدعملی سے رک جاتے۔"

بلکہ عقیدہ وعمل کے فساد کی تمام ہی ممکنہ صورتیں اس دور میں پائی جاتی تھیں، اللہ اور شعائر اللہ سے استہزاء و استخفاف بھی تھا، بزرگوں کے متعلق الوہیت کا اعتقاد بھی، مشاہد و مزارات کے حج وطواف کو حج بیت اللہ پر ترجیح بھی اور مساجد کی ویرانی کے ساتھ مشاہد و مقابر کی آبادی کا اہتمام بھی۔ گویا پورا مسلم معاشرہ اعتقادی اور عملی گمراہیوں کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔

بڑے بڑے محدثین اور ائمہ فن موجود تھے لیکن یہ سعادت صرف ابن تیمیہ کی قسمت میں تھی کہ وہ مجددِ اسلام کہلائیں اور ان کے ذریعہ مسلم معاشرہ گمراہیوں کے دلدل سے نکلے۔

صاحبِ تاریخ "دعوت وعزیمت" لکھتے ہیں:۔ امام ابن تیمیہ نے ان مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف جہاد و تجدید کا علم بلند کیا، عوام کی رضامندی و ناراضی، نیز خواص کا عوام کے قہر و عتاب سے بالکل بے نیاز ہوکر مروجہ اعمال و رسوم اور مشرکانہ عقائد و تخیلات پر تیشہ چلایا جو اس مشرکانہ طرز عمل کی بنیاد تھے۔

پھر یہ ابن تیمیہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے اور ان کی کوششیں کس حد تک نتیجہ خیز ہوئیں اس سلسلے میں لکھتے ہیں: امام ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ میں نیابت انبیاء کا فرض انجام دیا اور آیتِ قرآنی فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین پر عمل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان عقائد و رسوم میں جو جہالت غیر مسلموں کے اختلاط و صحبت اور فرقِ ضالہ اور اہل غرض کے اثر سے پیدا ہوگئی تھیں، ایک عام تزلزل پیدا ہوگیا۔ اسلام کا عقیدہ توحید جو انبیاء علیہم السّلام کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد اور ان کی دعوت کا نقطۂ مرکزی ہے ایک بار پھر نکھر کر اور منقح ہوکر سامنے آگیا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء عنی وعن جمیع المسلمین۔

بلاشبہ یہی کارنامہ ان کا اتنا عظیم کارنامہ ہے جو ان کے مجددِ اسلام ہونے کا زندہ ثبوت ہے مگر اس مجاہد وقت نے صرف دینِ اسلام کے افکار و عقائد کی تنقیح و تحقیق ہی کو اپنا مقصد حیات نہیں بنایا، اور اسی کی ترویج و اشاعت کو اپنا آخری ہدف نہیں سمجھا بلکہ اس مثبت پہلو کے ساتھ دوسرے منفی پہلو پر بھی نظر رکھی اور اسلام کے مقابل کسی حد تک زندہ دوسرے ادیان و مذاہب کا بھی محاسبہ کیا، ان کے عقائد و مسلمات کا جائزہ لیا۔ عقل و نقل کی ترازو پر تولا اور پھر سادہ اور فطری طرز استدلال سے مذہب اسلام کے تفوق و برتری کو ثابت کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے موافق عقل و نقل ہونے کو مبرہن کیا اور ہر غیر متعصب ذہن میں اس تصوّر کا نقش ابھارا کہ انسانی فوز و فلاح اور نجات اُخروی کا تمام تر ضامن اگر کوئی مذہب ہو سکتا ہے تو وہ صرف

اسلام ہی ہے۔ انّ الدّین عند اللہ الاسلام اور اسلام کے علاوہ دگر تمام مذاہب اپنی اپنی موجودہ شکلوں میں محض خود ساختہ تصورات اور متضاد روایات کا مجموعہ ہیں جس کی پشت پر نہ نقل صحیح کی قوت ہے اور نہ وہ عقلِ سلیم ہی کے تقاضے پر پورا اُترتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ بعض مذاہب کی تنقید و تردید میں ان کی ضخیم تصنیفات اپنی مثال آپ ہے جو ان کی وسعتِ نظر اور مطالعہ کے تنوع ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ تاریخ مذاہب سے کمالِ واقفیت اور اور سابقہ آسمانی صحیفوں پر گہری نظر ہونے کی روشن دلیل ہے۔

دین و مذہب کے متعلق ان کے تجدیدی کارنامے اور اصلاحی خدمات کے اس مختصر ترین خاکہ کے بعد آئیے اور دیکھئے علوم وافکار کی دنیا میں ان کی خدمات کے روشن نقوش!

اس حقیقت سے کوئی بھی انصاف پسند انکار نہیں کرسکتا کہ علم وفکر کی تنقید و تجدید میں بھی انکی خدمات مجتہدانہ اور بہت نمایاں ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ نے جب ہوش سنبھالا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ مختلف علوم کے ذخائر ضخیم کتابوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، کلام اور منطق و فلسفہ کے مسائل و مباحث کی فنون کی حیثیت سے تدوین ہو چکی تھی۔

مگر بدقسمتی سے یونانی فلسفہ و منطق کی مہارت اور اس کا درجۂ اختصاص معیار فضیلت قرار پاچکا تھا اور عالمِ اسلام پر منطقیانہ طرز استدلال اور فلسفیانہ موشگافیوں کا اس طرح رعب چھایا ہوا تھا کہ دگر خالص علوم دینیہ کے بیان و تبیین میں بھی منطق و فلسفہ کے مخدوش مقدمات اور ناقص اصطلاحات جگہ پاچکے تھے۔ دینی حقائق وعقائد کی تشریح بھی انہیں اصول وضوابط کی روشنی میں کی جاتی تھی جو مناطقہ و فلاسفہ کی بارگاہ میں قابل التفات بن سکے۔

اس ذہنی مرعوبیّت کا نتیجہ بعض اوقات اس طرح بھی نکلتا کہ مذہبی عقائد کے غیبی حقائق توہمات وخرافات کے مشابہ نظر آنے لگتے۔

علم کلام کے مباحث میں جہاں کہیں بھی اشاعرہ کو ٹھوکریں لگی ہیں اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ اس کا اندازِ فکر فلسفہ کے سانچے میں ڈھل چکا تھا، گویا فلسفہ طرازی اس دور میں فکر اسلامی کا رستا ہوا ناسور بن چکا تھا جس کے غلط اثرات اور اس کی گہری چھاپ تقریباً تمام ہی علومِ اسلامیہ پہ لگ چکی تھی۔

وقت کا تقاضہ تھا کہ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرتے ہوئے بے لاگ علمی محاسبہ کیا جائے اور ان فلسفیانہ عناصر کو فکر اسلامی سے خارج کیا جائے جو وہم وتخیل بن کر پوری ملت پہ چھاچکا ہے۔

وقت کی اس ضرورت کو محسوس کرنیوالوں میں سرفہرست ابن تیمیہ کا نام آتا ہے جس نے یونانی فلسفہ وحکمت کی مکمل تنقیح وتنقید کو اپنی زندگی کا مستقل موضوع بنایا، بڑی باریک بینی اور حقیقت شناسی سے کام لے کر یونانی فلسفہ وحکمت کے اصول موضوعہ ومسلمہ قواعد ومقدمات کو عقل کی خراد پر چڑھایا۔ مدلل انداز سے اس کی غلطیوں کو واشگاف کیا اور اپنی حریفانہ گفتگو اور علمی مناظروں سے یونانی حکمار کی بڑی سے بڑی شخصیت کے طلسم کو توڑ کر رکھدیا۔ اور یونانی فلسفہ وحکمت سے ذہنی مرعوبیت کے نتیجے میں تفسیری مباحث، کلامی دلائل اور فقہی مسائل میں غیر شعوری طور پر جو سطحیت اور تکلفات پیدا ہوگئے تھے اس کی نشاندہی کی، مجتہدانہ انداز سے نقد وتبصرہ کر کے حقیقتِ واقعیہ کو واضح اور مبرہن کیا اور بڑے شد ومد کے ساتھ علمار کے ذہنوں میں اس یقین وتصور کو پیدا کیا کہ مقاصد شریعت، مسائل تصوف، دینی عقائد اور غیبی حقائق کے اثبات کے لئے محفوظ تر اور طاقتور اسلوب دلنشیں اور مؤثر طرز استدلال وہی ہے جسے قرآن وحدیث نے سادہ اور فطری انداز سے پیش کیا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ انہیں اس راہ میں کہیں سخت ٹھوکریں بھی لگی ہیں، کہیں راہ اعتدال سے بہت دور بھی جا پڑے ہیں اور اس کے نتیجے میں ان کی بعض رائیں عام محققین اور مبصر اہل علم کی ایک جماعت کی رایوں سے متصادم بھی ہوئی ہیں۔

ان کے اس قسم کے تفرّدات "مختارات ابن تیمیہ" کے عنوان سے اپنی جگہ پر مفصل مذکور ہیں اور "جلار العینین" میں تو ان تمام مختارات پر اچھی اور عمدہ بحثیں موجود ہیں۔

ان تمام تفردات میں ان کی رائے اور تحقیق سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے بلکہ بعض مسائل فقہیہ کے بیان واستدلال میں ان کی مجتہدانہ شان کی رعایت کرتے ہوئے مجتہد مخطی ہی کہا جاسکتا ہے تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پہ اٹل ہے کہ علوم وافکار خصوصاً منطق وفلسفہ پر ان کی ناقدانہ خدمات انتہائی وقیع اور عظیم الشان ہیں جن کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

صاحب "تاریخ دعوت وعزیمت" نے یقیناً درست اور صحیح فرمایا ہے کہ عالمِ اسلام پر جب علمی وفکری زوال طاری ہوا، دماغوں اور قوتِ فکریہ نے اپنا کام آزادی سے کرنا چھوڑ دیا تو تمام

علمائے حکمت وفلسفہ بھی اپنے پیشروؤں کی لکیر کے فقیر بن گئے۔ ان کی تحقیقات وتصنیفات کے ناقل و شارح بن کر رہ گئے، معقولات ومنقولات میں کوئی فرق نہیں رہ گیا، یہی مشرق کا وہ دور انحطاط ہے جب علم وحکمت میں اضافہ، تجدید واجتہاد اور تخلیقی کام کا دروازہ بالکل بند ہوگیا۔

ہمارے قدیم علمی اور تدریسی حلقوں میں یونانی علوم اور ایرانی مصنفین کی کتابوں اور شروح و حواشی کو اس مضبوطی سے پکڑا گیا کہ گویا وہ "العروۃ الوثقیٰ" اور فکر ونظر کا سدرۃ المنتہیٰ ہیں۔ اس عقلی جمود و تقلید کے دشت بے نشان میں امام ابن تیمیہ کا یہ مجتہدانہ کارنامہ اور فلسفہ ومنطق یونانی کی علمی تنقید ومحاسبہ ایک سنگ میل اور چراغ راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور نئے اجتہاد وتفکر کا دروازہ کھولتا ہے۔

ابن تیمیہ کا آخری کارنامہ جسے ان کی خداداد دلیری وشجاعت اور باحوصلہ شخصیت کا لازمی تقاضہ کہا جاسکتا ہے وہ تھا سیاستِ مدن کے سلسلے میں ان کی اصلاحی کوششیں۔ ان کا دور گرچہ مسلم حکمرانوں کا دور تھا، عالمِ اسلام کی زمام حکومت مسلم فرمانرواؤں کے ہاتھ میں تھی اور ملکی سیاست پر بظاہر پورا تسلط مسلمانوں ہی کا تھا مگر حمایت دین اور اقامتِ حق سے عام غفلت تھی بلکہ مسلم فرمانرواؤں کی ظالمانہ طرز حکومت اور ہوس ملک گیری نے امن وسکون کا جنازہ نکال رکھا تھا۔ نومسلم تاتاری حکمراں، اسلام کا دعویٰ کرنیوالی جماعت شیعہ کی باطنیہ حاکمیہ وغیرہ شاخیں مسلم آزاری میں اپنی مثال آپ تھیں۔

مسلمانوں کے اس دور اقتدار میں حکومت وسلطنت، عدل وانصاف کی محافظ نہیں، ظلم وجور کی پشت پناہ تھی، امارت شرعی نہیں بلکہ اکثر وجوہ سے غیر شرعی تھی، ابن تیمیہ نے تمام ملکی حالات اور سیاسی امور کا بالغ نظری سے جائزہ لیا اور اہل زمانہ کے دینی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کیا اور حکمت عملی کے ساتھ تدریجاً ایسی تحریک چلائی کہ اس کے نتائج بڑے خوشگوار مرتب ہوئے۔

خلیق احمد نظامی اس کے متعلق لکھتے ہیں: امام ابن تیمیہ کی تحریک بہت ہمہ گیر تھی، انہوں نے مسلمانوں کے سماج، دین اور سیاست کے ایک ایک گوشے کو قرآن وحدیث کی روشنی میں پرکھا تھا اور اس کی اصلاح کی کوشش کی تھی، ان کی کتابوں "منہاج السنۃ" اور "السیاسۃ الشرعیۃ" کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے امور سیاسی کا بالغ نظری سے مطالعہ کیا تھا وہ اپنے معاصرین کے دینی شعور میں خلافت وامامت کا صحیح تصور بیدار کرنے کے لئے بے چین تھے۔

بلاشبہ ابن تیمیہ ایک متبحر اور مفکر عالم دین تھے، وعظ وتبلیغ، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف

کے ذریعہ علمی وفکری رہنمائی ان کا معروف اور اصلی فرض منصبی تھا، مگر تاریخ کی شہادت ہے کہ جب وقت کا تقاضہ اور حالات کے اشارے ہوتے ہیں تو وہ ہمت وعزیمت کے فرائض سے صرف نظر نہیں کرپاتے اور گوشۂ علم سے میدان عمل میں نکل آتے ہیں۔ اور پھر زمانہ کی آنکھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ نو مسلم غارتگر تاتاریوں کے خوف دہشت سے جب دمشق میں بھگدڑ مچتی ہے تو یہی ابن تیمیہ عزیمت واستقلال کا پہاڑ بن کر عوام کا سہارا بنتا ہے اور اپنی خداداد بصیرت وہمت سے مختلف حکمتِ عملیوں کے ذریعہ حالات کو قابو میں لانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ اور جب صبروایماں اور خلوص واستقامت کے ساتھ عملی اقدام کی کرشمہ سازیوں کے نتیجے میں دمشق کی عنانِ حکومت کچھ دنوں کے لئے ان کے اختیار میں آتی ہے تو بقول شیخ ابی زہرہ "امام صاحب اب تک جن باتوں کی تلقین عالمِ شرع کی حیثیت سے کرتے آئے تھے اب حاکمِ وقت کی حیثیت سے انہیں بروئے کار لانے لگے" چنانچہ اپنے رفقاء کار کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے، میکدوں پر پابندیاں لگادیں، جام ومینا شکست کردیئے، شراب کے بھرے مشکیزوں کا منہ کھول دیا گیا، میکدوں سے فواحش کا سلسلہ یکسر ختم کردیا گیا، عوام نے دیکھا اور یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ اب دین حکومت کا محکوم نہیں، حکومت دین کا خادم ہے، اب قرآن کا حکم نافذ کیا جاتا ہے اور عہد رسولؐ کو واپس لانے کی مبارک ومسعود کوششوں کا آغاز ہوچکا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ابن تیمیہ نے مقتضائے حال کے مطابق ملک اور ریاست کی اصلاح میں بھی بھرپور حصہ لیا اور کبھی "افضل الجہاد من قال کلمۃ حق عند سلطان جائرٍ" کا فریضہ انجام دیا تو کبھی "من رأی منکراً فلیغیرہ بیدہ" کا نمونہ پیش کیا؛ —————— ظاہر ہے کہ ان سطور میں انکی تفصیلات نہیں پیش کی جاسکتی اور نہ اس کی کوئی خاص ضرورت ہی ہے، تاریخ سے واقف حضرات اس کے شاہد عدل ہیں میں نے ابن تیمیہ علیہ الرحمہ کی خدمات کا ایک خاکہ پیش کرنا چاہا تھا، خدا جانے میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو۔ خود اپنا تو یہی احساس ہے کہ:- "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

اللہ دورِ حاضر کے ذمہ داران اور صاحب عزیمت علماء اور قائدین ملت کو ابن تیمیہ علیہ الرحمہ کی زندگی، ان کے خدمات، ان کی ہمت واستقامت، ان کی حکمتِ عملیوں اور سرفروشانہ جدوجہد سے سبق لینے کی توفیق دے۔ اور صرف اپنے لئے نہیں ملک وملت کے لئے جینا سکھادے۔

محمد رفیع الدین انتہائی

مذہبی تعصّب و نفرت اور جنگ وجدال

مولانا آزاد کے فکر انگیز خیالات

تاریخ کے دامن سے جن عبقری اور نادر روزگار شخصیتوں کے نام وابستہ ہیں ان میں مولانا ابو الکلام آزادؒ (۱۸۸۸ء - ۱۹۵۸ء) بھی ہیں۔ مولانا کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ گوناگوں اوصاف و محاسن کے حامل تھے اور انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا، جن کا حصر مشکل ہے۔ علم وفضل، حقائق دین، فلسفہ وحکمت، شعروادب، تصنیف وتالیف، تقریر وخطابت، اخبار نویسی وصحیفہ نگاری، سیاست اور قومی وملی خدمت غرض کونسا دائرہ اور کونسا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت ومسلم نہ تھی اور آج تک اس کی تصدیق وتوثیق نہ ہوتی رہی؟

مولانا آزاد کی ان ہمہ جہتی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خواجہ غلام السیدین نے جو قلمی سراپا کھینچا ہے وہ بہت خوب ہے، لکھتے ہیں:

"اس مرد مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا۔ وجاہت ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی۔ دماغ کی تابانی جو فکر وعمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی۔ دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا، سب کے لئے جگہ تھی۔ علم کی وہ فراوانی کہ حدوں کا پتہ نہ چلے۔ تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی ہی میں فسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت

اور نیا انداز بخشا، اور لفظوں سے کام لیا شعلہ اور شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور تلوار کا۔ مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں دین و دُنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکرِ حاضر سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔"

مولانا آزادؔ کی اس بلند و بالا حیثیت کو پیش نگاہ رکھئے۔ تاکہ ان کے ایک اہم فکر انگیز اور پر سوز مضمون کا جو تلخیص کے ساتھ اقتباس پیش کیا جارہا ہے اس کی اہمیت اور معنویت موجودہ زمانے کے مذہبی تعصب و نفرت اور مذہبی بحث و مباحثہ اور جنگ و جدال کے پس منظر میں واضح ہو سکے، مولانا نے یہ مضمون سورہ طٰہٰ آیت ۴۹ تا ۵۲ کی روشنی میں تحریر فرمایا ہے۔ ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مکالمہ نقل کیا گیا ہے۔ فرعون کا ہر سوال فتنہ بیز، اشتعال انگیز اور قوم کے افراد کو برانگیختہ کرنے والا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہر جواب مصلحانہ، حکیمانہ اور بھڑکے ہوئے جذبات کو سرد کرنے والا ہے۔

فرعون کا ایک نہایت نازک اور شر انگیز سوال حضرت موسیٰؑ سے یہ تھا کہ اگر بات یہی ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور زندگی میں کام کرنے کا راستہ بتایا، اس کے سوا کوئی دوسرا رَبّ نہیں ہے تو یہ ہم سب کے باپ، دادا جو تمہاری اس دعوت سے پہلے گزر چکے ہیں اور صدہا برس سے نسل در نسل دوسرے ارباب کی بندگی کرتے چلے آرہے ہیں، ان کی تمہارے نزدیک کیا پوزیشن ہے۔؟ (فما بال القرون الاولیٰ) کیا وہ سب گمراہ تھے؟ کیا وہ سب عذاب کے مستحق تھے؟ کیا ان سب کی عقلیں ماری گئیں تھیں؟ اس سوال کا جواب حضرت موسیٰ نے کمال دانائی کے ساتھ ایسا دیا کہ وہ بجائے خود حق بھی تھا اور ساتھ ساتھ اس نے فرعون کے زہریلے دانت بھی توڑ دیئے۔

حضرت موسیٰؑ کا جواب تھا: "عِلمھا عند ربی فی کتاب لا یضل ربی ولا ینسیٰ"

یعنی اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے، میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے

مولانا آزادؔ سوال و جواب کے اس حصہ پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

اس کے بعد فرعون نے دوسرا سوال کیا اور بطریق جدل کیا۔ "فما بال القرون الاولیٰ"۔ اچھا

اگر حقیقت حال ایسی ہی ہے (کہ پروردگار عالم وہی ہے جس کا تم نام لے رہے ہو) تو جو لوگ پچھلے عہدوں میں گذر چکے ہیں ان کے لئے کیا ہونا ہے؟ وہ راہِ صواب پر تھے یا گمراہی پر؟ انھیں تو تمہارے اس نئے اعتقاد کی خبر بھی نہ تھی۔ اگر یہ سوال امام فخر الدین رازیؒ سے کیا جاتا تو اس بحث میں صبح کر دیتے اور سارا معاملہ اسی میں الجھ کر رہ جاتا لیکن حضرت موسیٰؑ داعی تھے مجادل اور مناظر نہ تھے۔ انھوں نے صرف ایک بات کہہ کر ساری بحث ہی ختم کر دی "علمها عند ربی فی کتاب" اس کا علم اللہ کو ہے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اور ہمیں اس کی فکر کیوں ہو؟ ہمارے جاننے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ:۔ لا یضل ربی ولا ینسی۔ خدا انسانوں کی طرح نہیں کہ غلطی میں کھو جائے یا کوئی بات بھول جائے اس کا قانون یہ ہے کہ ہر انسان کا جیسا اعتقاد و عمل ہوگا ٹھیک اسی کے مطابق اسے نتائج بھی ملیں گے پس پچھلوں کا جیسا حال رہا ہوگا، ویسا ہی نتیجہ بھی بھگتیں گے۔ ہم کو اپنا حال دیکھنا ہے اور اپنے ہی سامنے کی باتوں کا ہم علم بھی رکھتے ہیں۔ ہم اس کاوش میں کیوں پڑیں کہ پچھلوں کا کیا حال تھا اور وہ بخشے جائیں گے یا نہیں؟

غور کرو فرعون کا سوال مجادلانہ تھا اور ایسا تھا کہ بحث و کاوش کی قسم کا کوئی جواب بھی دیا جاتا، مسکت اور مختتم کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو بات بھی کہی جاتی بحث طلب ہوتی اور ایک نیا سوال پیدا کر دیتی۔ لیکن انبیاءؑ کرام کا طریق دعوت یہ نہیں ہوتا کہ بحث میں اُلجھیں یا دوسرے کو الجھائیں پس حضرت موسیٰؑ نے اس کاوش میں پڑنے ہی سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا: ہم یہ جانتے ہی نہیں اور ہمیں اس کا خواہش مند بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ اسے جانیں۔"

اس کے بعد مولانا اس سلسلے میں ایک "اصل عظیم" کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے تاریخ و تجربہ اور دین و دیانت کا نچوڑ پیش فرماتے ہیں جس میں عبرت و نصیحت کے صدہا درس چھپے ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"پھر غور کرو انھوں نے اس جملے کے اندر جو بات کہہ دی وہ انسان کی فکری گمراہیوں کی کتنی راہیں بند کر دیتی ہے بشرطیکہ لوگ اسے سمجھیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ اس کاوش کی پیروی کرتے رہے جو فرعون کے سوال سے ٹپک رہی ہے وہ حقیقت نہ پا سکے جو حضرت موسیٰؑ کے جواب میں مضمر ہے حضرت موسیٰؑ کے جواب نے ہمیں یہ اصل عظیم بتلا دی ہے کہ جن گوشوں کا ہمیں علم نہیں اور جن کی کاوش

ہمارے لئے سودمند بھی نہیں ان کی فکر میں ہمیں نہیں پڑنا چاہیئے۔ اور ان کا حکم اللہ کے حوالے کر دینا چاہیئے اگر لوگ اس اصل عظیم پر عامل ہو جائیں تو مذاہب کے کتنے ہی گمراہ کن جھگڑے ختم ہو جائیں۔

ابھی دُور نہ نکلو، اسی گوشہ میں رہو، جو فرعون کے اس مجادلانہ سوال کی اصل جگہ ہے اور غور کرو مذہب کے نام سے کتنے جھگڑے بنالئے گئے ہیں جن میں سے ہر جھگڑا "فما بال القرون الاولیٰ" کی فرعونی صدا کا ٹھیک اعادہ ہے۔ اب سے پہلے جو فلاں گروہ گذرا ہے اہل حق میں تھا، یا اہلِ باطل میں؟ فلاں انسان جو گذر چکا ہے نیک تھا یا بد؟ فلاں بزرگ کا مرتبہ خدا کے نزدیک زیادہ ہے یا فلاں بزرگ کا؟ افضل کون ہے؟ زیدؔ یا عمروؔ؟ ولایت وطریقت میں سب سے بڑا کون رہا؟ فلاں یا فلاں؟ پھر اس میں بحثیں ہیں، تفضیلیں ہیں، لڑائیاں ہیں، فرقہ بندیاں ہیں۔ گویا انسان کی نجات کے لئے صرف یہی فکر کافی نہیں کہ خود اسے کیا کرنا چاہیئے؟ وہ اس فیصلے کے لئے بھی ذمہ دار بنا دیا گیا ہے اب سے پانچ سو برس پہلے کس نے کیا کیا تھا اور ایک ہزار برس پہلے کون کیسا تھا؟ پھر ان میں سے ہر فریق اس طرح حکم لگانا شروع کر دیتا ہے۔ گویا خدا کے دفتر کا رجسٹر ابھی ابھی پڑھ کر اٹھا ہے۔ اور اسے علم قطعی حاصل ہوگیا ہے کہ فلاں کا نام فلاں درجہ میں لکھا ہوا ہے۔ فلاں کا فلاں درجہ میں۔!

پچاس برس ہوئے شام میں مسلمانوں کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی بستیاں صرف اس لئے جلادی تھیں کہ ایک کہتا تھا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سب سے بڑے ولی ہیں (دوسرا کہتا تھا نہیں) شیخ احمد رفاعیؒ۔ ہندوستان کا یہ حال ہے کہ آج تک میرے پاس نہایت سنجیدہ عبارت میں لکھے ہوئے استفتا آتے رہتے ہیں۔

زیدؔ کہتا ہے: بڑے پیر صاحب (حضرت جیلانیؒ) سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

عمروؔ کہتا ہے: مجدد الف ثانیؒ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ "نماز کس کے پیچھے جائز ہے؟ ایک مرتبہ میرے جی میں آیا، لکھ دوں، دونوں کے پیچھے نہیں۔"

فقہی مذاہب کی پیروی کرنے والے اور شیعہ اور سنی کہلانے والے بسا اوقات ایک دوسرے کے خلاف جو شدید ہو جاتے ہیں اور آپس میں جنگ وجدال کی نوبت آجاتی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا دیدۂ عبرت کے لئے یہ سامان بصیرت فراہم کرتے ہیں۔

"فقہ کے مذاہب اربعہ جب مشخص و مدوّن ہوگئے تو سوال پیدا ہوا، ان چاروں اماموں میں افضل

کون ہے ؟ حضرت امام ابوحنیفہ ؒ یا حضرت امام شافعیؒ ؟ اب بحث شروع ہوئی اور بحث نے جنگ و قتال کی شکل اختیار کی ۔ چنانچہ ہلاکو خان کو اسلامی ممالک پر حملہ کی ، سب سے پہلی ترغیب خراسانیوں کے اسی جھگڑے سے ملی تھی ۔ ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی ضد میں آکر ہلاکو خاں کو بلوا بھیجا اور شہر کے پھاٹک کھول دیئے ۔ پھر جب تاتاریوں کی تلوار چل گئی تو اس نے نہ شافعی کو چھوڑا نہ حنفی کو فجاسوا خلال الدیار وکان وعداً مفعولاً ۔ (پس وہ تمہاری آبادیوں میں پھیل کر رہے اور اللہ کا وعدہ تو اسی لئے تھا کہ وہ پورا ہوکر رہے)

شیعہ ، سنی کے اختلاف نے مسلمانوں کو دو مختلف اُمتوں میں متفرق کر دیا لیکن ان تمام اختلافات کا ماحصل بھی کیا ہے ؟ یہی کہ فما بال القرون الاولیٰ ۔ اور تیرہ سو برس گذر گئے مگر اتنی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی " علمھا عند ربی فی کتاب لا یضل ربی ولا ینسیٰ ۔ "

مولانا نے اپنے مضمون کے آخر میں صحیح راستے کی نشان دہی فرمائی ہے ۔ ضرورت ہے کہ ہر طرح کی جذباتیت اور مذہب و مسلک کے ہر تعصب اور تنگ نظری سے الگ ہوکر اپنے آپ کو اس راستہ پر ڈالا جائے تاکہ ترقی کی راہیں کھلیں اور اختلاف و انتشار سے ہوا نہ اکھڑ جائے اور جڑیں کھوکھلی نہ ہوجائیں مولانا تحریر فرماتے ہیں :

" بہر حال یاد رکھنا چاہیئے کہ اس طرح کی تمام کاوشوں کے اندر وہی فرعون والی مجادلانہ روح کام کیا کرتی ہے اور طریقِ موسوی یہ ہے علمھا عند ربی فی کتاب کہہ کر سارے جھگڑے ختم کر ڈالنا ، اور سرے سے ان کاوشوں میں پڑنا ہی نہیں ، قرآن کا ایک دوسرا ارشاد ہے ۔ تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون (البقرہ آیت نمبر ۱۳۴) یعنی ایک جماعت ہے جو گذر چکی ۔ ان کے آگے ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے آگے تمہارا کیا ہوا ، اور وہ جو کچھ کرتے رہے ، اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی ۔

قرآن اور صاحبِ وحی نے ہمیں جن اُمور کی خبر دے دی ہے ان کا علم ہمیں حاصل ہوگیا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ان باتوں کو اسی طرح یقین کریں جس طرح بتلادی گئی ہیں لیکن ان سے زیادہ جو سوال بھی دینی عقائد کی بنا پر اٹھایا جائے گا ، ہمارا جواب یہی ہوگا علمھا عند ربی فی کتاب لا یضل ربی و لا ینسیٰ ۔ اللہ نے اپنے دفتر کی مثلیں ہمارے پاس نہیں بھیج دی ہیں اور نہ ہمیں لوگوں کی سعادت

وشقاوت اور مدارج فضائل کے فیصلہ کی ٹھیکہ داری عنایت فرمائی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں۔ حقیقت حال کیا ہے البتہ خوش قسمتی سے معاملہ ایسے محاسب کے ہاتھ ہے جو نہ تو غلطی کر سکتا ہے نہ بھول چوک میں پڑ سکتا ہے۔ پس دوسروں کی فکر میں تمہیں پگھلنے کی ضرورت نہیں، (حکیمانہ انداز میں دین کی دعوت کا کام کرتے ہوئے) اپنی خبر لو اور ان کا معاملہ ان کے خدا پر چھوڑ دو۔" ■■

حکایات وواقعات

چھوٹی بات، بڑی تبدیلی

شراب کا دور چل رہا تھا اور زاذان نامی ایک مغنّی بربط پر گا رہا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کا گزر ادھر سے ہوا۔ مغنّی کی آواز سن کر فرمایا:

"کیا ہی اچھی آواز ہے۔ کاش! اس آواز سے قرآن پڑھا جاتا۔"

عبداللہ بن مسعودؓ چلے گئے، مگر زاذان نے ان کی آواز سن لی تھی۔ اس نے لوگوں سے پوچھا: "یہ کون شخص تھا"؟

"عبداللہ بن مسعودؓ تھے" لوگوں نے جواب دیا۔ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر ساتھی"

"کیا فرما رہے تھے؟" زاذان نے دریافت کیا۔

"کہتے تھے کتنی اچھی آواز ہے، کاش! اس آواز سے قرآن پڑھا جاتا۔"

یہ سنتے ہی زاذان کی حالت غیر ہو گئی۔ دل میں ایک ہوک اٹھی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے اٹھا۔ بربط کو زمین پر مار کر توڑ ڈالا اور پھر دوڑتا ہوا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس پہونچا اور ان کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔ عبداللہ ابن مسعودؓ نے اسے اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا، اور خود بھی رونے لگے۔ پھر بولے:

"جس شخص سے خدا محبت کرتا ہے، میں اس کو اپنا دوست کیوں نہ بناؤں؟"

اب زاذان حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی خدمت میں رہنے لگے۔ قرآن سیکھا اور دوسرے علوم پڑھے اور ایسا کمال حاصل کیا کہ آج ان کا شمار ائمہ تابعین کی صف اوّل میں ہوتا ہے۔

اقبالؔ کے ایک شعر کی صحیح تعبیر

پروفیسر صبیح الدین احمد انصاری
(مقیم شارجہ)

کچھ دنوں پہلے ڈاکٹر محمود الٰہی کا ایک مضمون "آجکل" میں نظر سے گزرا تھا۔ محمود الٰہی صاحب کی یہ رائے صحیح ہے کہ اقبالؔ کا یہ شعر ؎

محمّد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

ان اشعار میں سے ایک ہے جو کثرتِ تعبیر سے معمّہ بن گئے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے بعض دیگر شارحین، مثلاً پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور مولانا غلام رسول مہرؔ کی تعبیرات سے بحث کرنے کے بعد وہ مفہوم بھی بیان کیا ہے جو خود ان کے نزدیک صحیح ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر محمود الٰہی کی نظر بھی اس مفہوم تک نہیں پہنچ سکی جو شاعر نے مراد لی ہے

شعر کے مفہوم پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات صاف ہو جانی چاہیئے اور وہ یہ کہ خود نثر ہو یا نظم، کوئی بھی صنفِ سخن ہو، بہرحال اظہار کا ذریعہ الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ اسی لیے سب سے پہلے ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ الفاظ اپنے منہ سے کیا بول رہے ہیں۔ اگر مطلب واضح ہے تو دور از کار بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر الفاظ ہماری واضح رہنمائی کرنے سے قاصر ہوں، یا ان میں ابہام ہو تو یقیناً ہمیں دماغی ورزش سے کام لینا پڑے گا۔ اگر الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو ذو معانی ہیں یا لہجے کے فرق سے اپنا مفہوم بدل لیتے ہیں تو ہمیں شاعر کی زندگی اس کی افتادِ طبع، اس کے ماحول، اس کے عقیدے اس کے شعری نظریئے اور اس طرح کی بہت سی دوسری باتوں کا مطالعہ

کرنا پڑے گا، اس کے بعد ہی کوئی مفہوم متعین ہو سکے گا اور وہی مفہوم صحیح ہوگا جو شاعر کے پورے مزاج اور اور فکر سے ہم آہنگ یا قریب تر ہو، لیکن یہاں بھی یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ اگر ایک سے زیادہ مفہوم ایسے ہوں جو بیک وقت قرین قیاس معلوم ہوتے ہوں تو اسی مفہوم کو ترجیح دینی چاہیئے جو دوسروں کے مقابلے میں بلند ہو۔ اقبالؔ کے متذکرہ بالا شعر کے ساتھ ہمارا یہی رویہ ہونا چاہیئے۔

سب سے پہلے پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی تشریح کو لیجیے۔

پروفیسر چشتی نے دو مختلف تشریحات کی ہیں، لیکن دونوں میں ایک قدرِ مشترک ہے، اور وہ یہ کہ حرفِ شیریں سے بہ قول ان کے اقبالؔ نے جذبۂ عشق مراد لیا ہے۔ اسی طرح مولانا غلام رسول مہرؔ نے بھی جذبۂ عشق ہی کو "حرفِ شیریں" کا مصداق قرار دیا ہے۔

لیکن ان دونوں حضرات پر ایک تو وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو ڈاکٹر محمود الٰہی نے کیا ہے، یعنی، اگر یہ استعارہ ہے تو مستعار لہ اور مستعار منہ میں وجہ جامع کیا ہے؟ نیز یہ کہ اس میں نہ کوئی اشارہ بعید ہے اور نہ کوئی استعارۂ غیر متبادرہ۔

ظاہر ہے کہ ان تمام شارحین نے جنھوں نے "حرفِ شیریں" کی تعبیر جذبۂ عشق سے کی ہے، شاعر کے الفاظ سے زیادہ اپنے تخیّل اور اپنی فکر کا سہارا لیا ہے، لیکن ایسی کوشش کو دور از کار ہی قرار دیا جائے گا۔ اس لیے کہ "حرفِ کلام کا متبادل یا مترادف ہے۔ یہ زبان سے ادا ہوتا ہے، اس کے برعکس "جذبہ" کا تعلق انسان کے اندرون سے ہے اس کے لیے زبان سے اظہار ضروری نہیں۔ یہ عمل سے بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ پروفیسر چشتی کا بیان کردہ پہلا مفہوم علم بیان کے بُنیادی اصول کے خلاف ہے۔ آیئے اس پر رائے زنی سے پہلے ان کی تشریحات کا متعلقہ اقتباس پڑھیں۔ چشتی صاحب لکھتے ہیں۔

"اے خدا اس میں شک نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل اور قرآن حکیم، یہ تینوں تیرے ترجمان ہیں لیکن یہ حرف شیریں یعنی جذبۂ عشق و محبت جو انسان کے قلب میں موجزن ہے، یہ بھی تو تیرا ہی ترجمان ہے، یعنی یہ بھی تو تیرا ہی پیدا کردہ ہے۔"

اب سوال یہ ہے کہ شاعر اگر اتنا ہی کہنا چاہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت جبریل علیہ السلام

قرآن کریم اور میرا کلام سب تیرے ہی ترجمان ہیں تو اس میں "مگر" کی کیا ضرورت ہے۔ "مگر" تو تناقض ظاہر کرتا ہے۔ "مگر" کا استعمال اسی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے بعد آنے والا کلام سابقہ کلام کی ضد یا متخالف ہو مثلاً غالب کہتے ہیں ۔ ؎

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ❀ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

یعنی اگرچہ آپ رہے تھے مگر کسی نے آپ کی راہ میں حائل ہو کر آپ کو جلدی آنے نہ دیا۔ اقبال کے زیر نظر شعر میں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ "حرفِ شیریں" سے مراد جذبہ عشق ہے اور یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت جبریل علیہ السلام اور قرآن کریم کی طرح ایک ہی ہستی کی ترجمانی کا فرض انجام دے رہا ہے تو اس کا اظہار جس جملہ یا فقرہ سے ہوگا اسی میں "مگر" کا استعمال بے محل ہوگا۔ کیونکہ یہاں مضمون میں کوئی تخالف موجود نہیں ہے البتہ اگر، "مگر" کی بجائے، "مگر بھی" سے کام لیا جائے تو یہ سقم دور ہو سکتا ہے لیکن یہاں یہ صورت بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ مصرعہ ثانی خبریہ نہیں سوالیہ ہے۔ محاورۃً یوں تو صحیح ہو سکتا ہے کہ "مگر یہ حرفِ شیریں بھی تیرا ہی ترجمان ہے"۔

یوسف سلیم چشتی کے دوسرے اور غلام رسول مہر کے واحد مفہوم پر (جس میں جذبہ عشق کو "یہ" کا مشارٌ الیہ مان کر اسے خود اپنا ترجمان بتایا گیا ہے) ایک اعتراض تو وہی ہے جو محمود الٰہی کے حوالے سے اوپر نقل کیا گیا ہے یعنی اسم اشارہ اور مشارٌ الیہ کے درمیان بعد اور تفاوت۔ دوسرا یہ کہ یہ حضرات یہ بتائیں کہ "حرفِ شیریں" کو جذبہ عشق کا متبادل قرار دینے کے لیے ان کے پاس کیا قرینہ اور کیا فکری بنیاد ہے؟ کیا جذبہ "حرف" ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟ پھر جذبہ عشق کو خود اقبال یا ان سے پہلے اور بعد کسی دوسرے شاعر، مفکر، صاحبِ حال یا صاحبِ قال نے کہیں حرف کہا ہے؟ کم از کم میری نظر سے ایسی تعبیر نہیں گذری۔

اب آیئے اس مفہوم کی طرف جو ڈاکٹر محمود الٰہی نے سمجھا ہے اور ہمیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا تحریر کردہ مفہوم اس طرح ہے:

"اقبال نے اپنے کلام کو حرفِ شیریں کہا ہے، بس اس کے علاوہ اس میں اور کوئی خاص بات نہیں۔ اقبال نے پہلے مصرعے میں سرور کائنات ؐ۔ جبریلؑ۔ قرآن اور خدا کے درمیان جس تعلق کو واضح

کرنے کی کوشش کی ہے، وہ عبارت ہے کلام اور پیغام سے۔ دوسرے مصرعے میں وہ "حرف" کا لفظ لائے ہیں اور کوئی ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جس کا اطلاق نطق اور کلام پر ہو۔ دونوں مصرعوں میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو ذہن کو نطق، کلام اور پیغام کے علاوہ کسی اور امر کی طرف منتقل کرے۔

اس میں دو راز کار استعارے کا استعمال نہیں کیا گیا ہے، اس میں "یہ" حرفِ شیریں" ہے، وہ خود سامنے کی چیزوں پر دال ہے یعنی یہ میری شاعری، یہ میری باتیں، یہ حرف و حکایت، یہ گلے، شکوے، یہ سب تیرے پیدا کردہ ہیں۔ میں شاعر ہوں تو اس میں میرا قصور؟ میں وہی کہتا ہوں جو تم کہلواتے ہو۔"

اس مفہوم پر ایک تو وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر ہر شئے ایک ہی ہستی کی ترجمانی کر رہی ہے تو "مگر" کے استعمال کا کیا جواز ہے؟ اگر اس مفہوم کو صحیح مان کر شعر کو نثری قالب میں ڈھالا جائے تو جملہ کچھ اس طرح بنے گا:

"محمدؐ، جبریلؑ اور قرآن تیرے (ترجمان) ہیں مگر میرا کلام تیرا ترجمان ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ جملہ نہ صرف یہ کہ خلافِ محاورہ ہے بلکہ قواعد کے اعتبار سے بھی غلط ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنے شعر میں جو لفظ "یہ" استعمال کیا ہے، یہ اسمِ اشارہ قریب ہے۔ یہ تبھی استعمال ہو سکتا ہے جب مشارٌ الیہ زمان، مکان یا سیاق کے اعتبار سے قریب ہو۔ اس حقیقت کا اعتراف اپنی تعبیر پر گفتگو کرتے ہوئے خود محمود الٰہی صاحب نے بہ ایں الفاظ کہا ہے۔

"اس میں جو "یہ" ہے وہ خود سامنے کی چیز پر دال ہے یعنی یہ میری شاعری، یہ میری باتیں، یہ حرف و حکایت، یہ گلے شکوے۔"

اصول تو صحیح ہے کہ "یہ" دلالت کرتا ہے سامنے کی چیز پر، مگر فاضل مقالہ نگار کی اپنی تعبیر پر اس کی تطبیق درست نہیں ہے اس لیے کہ شعر میں نہ "میری شاعری" سامنے کی چیز ہے، نہ "حرف و حکایت" یا "گلے شکوے" کا دُور دُور تک کوئی پتہ ہے، اسی لیے یہ تعبیر بھی کھینچا تانی سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہ تو ہوا پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر محمود الٰہی کی تعبیرات کا تجزیہ۔ اب میں اس تعبیر کی طرف آتا ہوں جو میرے ذہن میں ہے۔ اور جسے میں اقبالؔ کی پوری فکر، ان کے مزاج، ان کے فلسفے اور سب سے بڑھ کر خود شعر کے داخلی شواہد کی بنیاد پر صحیح سمجھتا ہوں۔ شعر کو ایک مرتبہ پھر پڑھئے

محمدؐ بھی ترا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا ٭ مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

غور کرنے کی ضرورت ہے ان میں جن تین چیزوں کا ذکر ہے ان میں سب سے آخری قرآن ہے، دوسرے مصرعے میں "مگر" کے بعد (جو حرف عطف ہے) سب سے پہلے "یہ" ہے جو اسم اشارہ قریب ہے۔ ظاہر ہے اصول و قواعد کے مطابق قریب ترین ہونے کی وجہ سے "یہ" کا مشارٌ الیہ قرآن ہی کو ہونا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ "یہ" کا مشارٌ الیہ کبھی کبھی معہود ذہنی بھی ہوتا ہے، مگر شعر کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ اس کا مشارٌ الیہ، قرآن ہی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ "حرف" کے لفظ سے اس کی تعبیر عین قرین قیاس ہے۔ گویا شعر کا مفہوم یوں ہوا:

"اے خدا! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت جبریل علیہ السلام اور قرآن کریم سب تیرے ہیں، مگر یہی کلام (جس کے ہم تک پہنچنے میں نبی اکرمؐ اور حضرت جبریلؑ واسطہ بنے) ترجمانی کس کی کر رہا ہے؟ میری اور صرف میری۔"

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم شاعر کی (یا بندۂ مومن کی) ترجمانی کس طرح کر رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ادبی شاہکار کا کوئی نہ کوئی موضوع ہوتا ہے؛ اگر یہ شاہکار کسی افسانے، ناول یا ڈرامے کی شکل میں ہو تو اس کا ایک ہیرو ہوتا ہے۔ یہ سارا شہ پارہ اسی کے گرد گھومتا ہے۔ مثلاً شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے ہیملٹ کی مثال لے لیجیے۔ ظاہر ہے کہ یہ ڈرامہ اپنے مرکزی کردار یعنی ہیملٹ کے گرد گھومتا ہے۔ اس میں اس کی زندگی اس کے مسائل، اس کی شخصیت، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستان درج ہے۔

ٹھیک اسی طرح قرآن کریم جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریلؑ امین کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے یہ اللہ کا کلام ہے لیکن اس کا ہیرو میں ہوں۔ یعنی مردِ مومن ہے۔ اس میں میرے ہی خد و خال اُجاگر کیے گئے ہیں۔ اس میں میرے ہی کردار اور اوصاف سے بحث کی گئی ہے۔

"سورہ بقرہ" کی ابتدائی آیات ہی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کتاب ان متقیوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اس کے علاوہ "سورہ فتح" میں اصحاب محمدؐ کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ انکار (کفر) کرنے والوں پر سخت گیر اور آپس میں نرم خُو ہیں۔

غرض قرآن کریم کا کوئی صفحہ کھول جائیے۔ اس میں مردِ مومن کے جمیل مقاصد، اس کے جلیل ارادوں،

حق کے لیے جاں نثاری ، باطل کے خلاف اس کا جہاد ، اس کی غیرت ، اس کی للّٰہیت ، اس کی فکرِ آخرت اور اسی طرح کی دیگر خصوصیات کا ذکر ایسے دل نشیں پیرائے میں ملے گا کہ اس کے خدوخال اُجاگر ہو کر پوری طرح ہمارے سامنے آجائیں گے اور وہ ایک ایسا زندہ اور متحرک کردار بن کر اُبھرے گا ، جسے ہم جہاں دیکھیں گے پہچان لیں گے ۔

اقبالؔ کی نظر میں انسان کامل کی حقیقی تعبیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ملتی ہے انھیں کی ذات اقبالؔ کا مردِ مومن اور آئیڈیل انسان ہے ۔

مشہور واقعہ ہے کہ کچھ لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ کے بارے میں کچھ بتائیے ۔ آپ نے سوال کیا ۔ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ؟ انھوں نے عرض کیا پڑھتے ہیں ۔ اس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے فرمایا : ۔ خلقہ القرآن یعنی خود قرآن آپ کے عادات و اخلاق کی تعبیر ، اس کی تفسیر اور اس کا ترجمان ہے ۔ اقبالؔ نے ٹھیک اسی مفہوم کو اور ایک جگہ اس طرح کہا ہے ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن ٭ قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

یہاں مردِ مومن کو عین قرآن قرار دیا گیا ہے ۔ اب دیکھئے شعر کا وہ مضمون جو میں نے عرض کیا ہے ۔ نحوی اعتبار سے کتنا منطقی ، شاعر کے مزاج اور نظریہ سے کتنا ہم آہنگ اور کس قدر بلند ہو گیا ۔ اقبالؔ حضرتِ یزداں میں بھی چپ رہنے کا قائل نہیں ۔ خدا کے دربار میں بھی وہ اپنی اہمیت سے دست بردار نہیں ہوتا ۔ کہتا ہے کہ تیرے پیارے رسول اور تیرے مقرب فرشتے کے ذریعہ جو قرآن تیری صفت کلام بن کر آشکارا ہوا درحقیقت وہ میرا ہی تعارف ، میری ہی ترجمانی کا فریضہ انجام دے رہا ہے ۔ اسی لیے اگر تیرے لیے کبریائی باعث "فخر" ہے تو میرے لیے بھی قرآن کریم کا مرکزی کردار اور اس کی غایت اولیٰ ہونا وجہ افتخار ہے بلکہ اقبالؔ کو تو اپنی بندگی پر اس درجہ ناز ہے کہ اس کے عوض وہ خدائی بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ۔ ع

نہ لوں شانِ خودی کو بیچ کر شانِ خداوندی

اقبالؔ نے ایک اور موقع پر اس بات سے انکار کیا ہے کہ مردِ مسلمان محض قرآن کریم کا قاری ہے ۔ ایک نوجوان طالب علم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے ؎

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو ٭ کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

درحقیقت اقبالؔ بندۂ مومن کو نہ صرف صاحبِ کتاب بلکہ عین کتاب مانتا ہے۔ یہی نہیں، زیرِ بحث شعر میں وہ خود کو متن اور قرآن کریم کو اس کی شرح سے تعبیر کر رہا ہے۔

ان مثبت دلائل کے علاوہ ایک منفی دلیل بھی ہے جو خاصی اہم ہے وہ یہ کہ اقبالؔ نے اپنے کلام کو "حرفِ شیریں" کہنے کی جسارت کبھی نہ کی۔ اور پھر قرآن کریم کے ذکر کے فوراً بعد گویا اس کے مقابلے میں! اس طرح کی تعلّی، اس طرح کے سوئے ادب سے انھوں نے ہمیشہ دامن بچایا۔ وہ اپنی شاعری کو شاعری نہیں سراسر پیغام سمجھتے تھے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ✽ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری ✽ وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص اپنے کلام کو "شاعری" ہی کی تعریف سے خارج اور اس زمرہ سے باہر سمجھتا ہو وہ اس کو کس طرح سے "حرفِ شیریں" سے تعبیر کر سکتا ہے۔ اقبالؔ کو نہ اپنی زبان و بیان پر ناز تھا، نہ فنی کمال کا دعویٰ۔ وہ تو حُسنِ زبان اور حُسنِ بیان کو اپنے لیے غیر اہم بلکہ غیر ضروری سمجھتے تھے۔ دلیل یہ دی کہ

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حُسنِ معنی کو ✽ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

پھر یہ کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ انھوں نے اس شعر کی حد تک جو اس وقت زیرِ بحث ہے، اپنا زندگی بھر کا نظریہ بدل ڈالا، اور اسے "حرفِ شیریں" کہنے کی جرأت رندانہ کر ڈالی۔ حالانکہ مصرعۂ اولیٰ میں قرآن کریم کا ذکر کرتے وقت انھوں نے اس طرح کی کوئی صفت استعمال نہیں کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ "حرفِ شیریں" سے ان کی مراد اپنا کلام نہیں بلکہ خود قرآن ہے۔

زیرِ نظر شعر کے دوسرے مصرعے کی ترکیب نحوی میں بھی بعض اچھے خاصے منجھے ہوئے یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو ایک اور دلچسپ مغالطہ ہوا ہے۔ یہ لوگ "شیریں ترجمان" کو خود ایک مرکب توصیفی قرار دے کر "حرف" کی صفت مانتے ہیں۔ گویا وہ اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ "وہ حرف (یا کلام) جو شیریں ترجمان ہے۔ یہ سراسر اصول و قواعد کے خلاف ہے۔ "شیریں" فارسی کا لفظ ہے اور صفت ہے۔ اس کا موصوف کوئی اسم ہی ہو سکتا ہے۔ جیسے "شیریں کلام" "شیریں مقال" وغیرہ۔ جو کلمہ خود صفت مشبہ یا اسم فاعل ہو جیسے "ترجمان" "گویا" وغیرہ وہ "شیریں" یا "تلخ" وغیرہ کی صفت نہیں بن سکتا۔ میں اور بھی کئی دلائل اپنی اس تعبیر کے سلسلے میں دے سکتا ہوں۔ خاص طور سے یہ ثابت کرنے

کے لیے کہ اقبال کی نظر میں قرآن کریم کا کتنا احترام اور کتنی منزلت ہے وہ اس کو حرز جاں بنا کر رکھتے تھے اور اس کی تلاوت کے وقت ان پر کیسی خشیت طاری ہوتی تھی، ساتھ ہی ساتھ اپنی شاعری، اپنے فن، اپنی صناعی، اپنے بیان اور اپنی زبان کو وہ کسی قدر ہیچ سمجھتے تھے، لیکن سردست آتنا ہی کافی سمجھتا ہوں۔ اس کے خلاف کوئی رائے آئی تو انشاء اللہ مزید عرض کروں گا۔ ■■

حکایات وواقعات

تقرّبِ الٰہی کا طریقہ

ابو مسلم فارس بن غالب، شیخ ابو سعید ابو الخیر فضل اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو دم بخود رہ گئے۔ وہ تو شیخ کی درویشی اور خدارسیدگی کا چرچا سُن کر ان سے فیض یاب ہونے آئے تھے، لیکن یہاں تو عالم ہی دوسرا تھا۔ شیخ ابو سعید ایک مسند پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ایک پاؤں اپنی دوسری ٹانگ پر بڑی تمکنت سے رکھے ہوئے تھے۔ لباس عمدہ اور برف کی طرح سفید تھا اور ایک بیش قیمت مصری چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ادھر ابو مسلم کا یہ حال کہ بہت معمولی کپڑے بدن پر تھے اور وہ بھی میلے کچیلے، جسم مجاہدے سے دُبلا پتلا اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔ دل میں بیزاری کے جذبات پیدا ہوئے۔ اپنے آپ سے کہنے لگے: میں بھی درویش ہوں اور یہ بھی درویش ہے۔ میں ریاضت اور مجاہدے سے پگھلا جاتا ہوں اور یہ بڑے عیش اور آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔

شاید چہرے نے دل کے جذبات کی غمازی کی۔ ابو سعید بھانپ گئے فرمایا: "ابو مسلم! تم نے کس کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ صاف ستھرا رہنا، اچھی غذا کھانا اور عمدہ لباس پہننا شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے؟ اور یہ کہاں لکھا ہے کہ عمدہ لباس پہننے اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے والا درویش کہلانے کا مستحق نہیں؟ جب میں نے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا کیا اور دامن طاعت ہاتھ سے نہ چھوڑا تو خدا نے مجھے تخت پر بٹھایا اور مزید نعمتیں عطا کیں۔ لیکن جب تم نے محض اپنے آپ کو دیکھا اور رہبانیت اختیار کر کے اللہ سے اس کی جائز نعمتیں بھی طلب نہ کیں تو فرش خاک پر بیٹھنے اور میلے کچیلے کپڑے پہننے کے سوا تمہیں کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہمارے حصہ میں مشاہدہ آیا اور تمہارے حصہ میں مجاہدہ، لیکن مشاہدہ مجاہدے سے بہت بلند چیز ہے۔"

ابو مسلم خاموش بیٹھے سُن رہے تھے۔ شرم وندامت سے ان کا سر جھک گیا تھا۔ انھیں زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ کسی شخص کے ظاہر کو دیکھ کر اس کے باطن کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کا تقرب، رہبانیت کی زندگی بسر کرنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اپنے جسم وروح اور اہل وعیال کے تقاضے اور اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق پورے کرنے سے ملتا ہے۔

نمودِ سحر

خالد سیف اللہ رحمانی

کس نے صحراۓ عرب کو کر دیا رشکِ جناں
کس کی شمشیرِ محبت فاتحِ تیغ و سناں

کس کے ہاتھوں سے جلا تہذیب کا روشن چراغ
کس نے فکر و فن کو بتلایا ہے منزل کا سراغ

کون اُمّی تھا مگر تعلیم ارزاں کر گیا
اور دنیا کے اندھیروں میں چراغاں کر گیا

کس کی آمد سے چھٹیں یہ آندھیاں تیرہ گھٹا
یہ غلامی، یہ عبودیت، ستم، جور و جفا

کس نے کانٹوں پر نظر کی اور وہ گُل بن گئے
سنگہاۓ سخت کو چھوا تو وہ دِل بن گئے

کس کی اکسیرِ نظر نے کر دیا لوہے کو موم
کس نے پہنایا عمر کو پیرہن فاروق کا

شوق فرماتے تھے کس پر نیزہ بازِ دل تراش
لوحِ دل پر پھر بھی ممکن تھا نہ آجاۓ خراش

کس نے بیماروں کو دنیا کا مسیحا کر دیا
کس نے بے ہنگام نغموں کو پپیہا کر دیا

کس نے صحرا کو کیا سرچشمۂ آبِ حیات
کس کے خوں سے سرخ ہے اسلام کا روۓ ثبات

جھوم لے بادِ نسیم! ہاں جھوم لے بادِ صبا!
رقص کر خورشید! اور آراستہ ہو کہکشاں!

چاند! پھر سنگار کر اپنے رخِ گلنار کا
جائزہ لے لے شفق! پھر سرخیِ رخسار کا

زلفِ گُل برہم ہوا چاہے ہے دوشِ باد پر
کیوں نہ آثارِ جنوں طاری ہو اب فرہاد پر

کہ یہی دن ہے کہ جب پیدا ہوۓ شاہوں کے شاہ
آج ہی انسان نے پہنی ہے عظمت کی کلاہ

اے کہ اس کی بزم ہے خم خانۂ آبِ حیات
وہ مسیحِ آدمیت، وہ مسیحِ کائنات

اس سے پہلے بھی یہ عالم تھا مگر افسردہ تھا
گلشنِ انسانیت بے روح تھا، پژمردہ تھا

کوئی گوشہ نورِ فطرت کا نہیں تابندہ تھا ابنِ آدم سے یہاں ابلیس بھی شرمندہ تھا

مزدک و مانی سے دامانِ تمدن تار تار امتیازِ رنگ و خوں سے آدمیت شرمسار

آتشیں پیغامِ موسیٰؑ در غبار اندر غبار اور تھا تاریکیوں کا وحشتوں کا اقتدار

ہند نے صہبائے حکمت توڑ دی، ہاں توڑ دی آلِ اسماعیلؑ نے سمتِ سفر ہی موڑ دی

روم نے بھی شیشۂ مئے مسیحا پھوڑ دی اور فارس نے وہ رسمِ زرد تشتی چھوڑ دی

ہند کی یہ سرزمیں، یہ رام کی قدسی امیں جس میں مردِ آشتی گوتم نے خم کی تھی جبیں

اب یہاں شودر برہمن کا نہ ہوتا ہم نشیں یہ تھے گویا خار اور وہ نسترن و یاسمیں

ظلمتوں کی زد میں تھا اب یہ جہاں یہ کائنات بادلوں میں گم تھے سارے ماہ و انجم، آفتاب

تھی بھنور کے بیچ و خم میں کشتیِ روحِ حیات رنگ و خون و نسل کے ہر سمت تھے لات و منات

اس گھڑی دنیا میں تو آیا مثالِ ماہتاب خود بخود کٹتی گئی زنجیرِ طوفان و سحاب

مٹ گیا یک لخت قصرِ کفر کا وہ آب و تاب جیسے کاٹے ہے جگر ظلمت کا قرصِ آفتاب

آگئی پژمردہ گلشن میں وہ رونق وہ بہار جیسے کھیتی خشک ہو، آئی ہو بادل کی پھوار

جیسے جوہی سے ہوا جاتا ہو شبنم ہم کنار اور جیسے چھا گیا ہر سمت ساون کا نکھار

مٹ گئے جبر و تشدد کے وہ قہرمانے مٹ گئے
کٹ گئے، انساں سے زنجیرِ غلامی کٹ گئے

○

تذکروں کی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی اہمیت

****

جناب ایس محمد شرافت علی
سنٹرل یونیورسٹی، حیدر آباد

تذکرہ عربی لفظ ہے، جسے اہلِ زبان، یادداشت کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں، اصطلاحی طور پر عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں اس کا اطلاق ایسی کتاب پر ہوتا ہے جس میں شعرا کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کا منتخب کلام درج ہو۔ اگر کسی کتاب میں مختلف شعرا کا کلام، صرف نام اور تخلص کے ساتھ، لکھا گیا ہو تو، وہ "بیاض" کہلائے گی، اور جس میں نمائندہ اور منتخب شاعروں اور نثر نگاروں کی زندگی اور شخصیت کے تفصیلی مطالعے کے ساتھ ساتھ، ان کے فن کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہو تو یہ "تاریخِ ادب" History of Literature کی تعریف میں آئے گی۔

اُردو ادب میں بعض دیگر اصطلاحات و اصناف کی طرح، تذکرہ نگاری کا فن بھی عربی اور فارسی کے زیرِ اثر ہوا، جس کی ایک بڑی مثال میرؔ کے "نکات الشعرا" (جو اولین تذکروں میں شمار ہوتا ہے) سے پہلی "تاریخِ ادب" "آبِ حیات" (سنہ تصنیف ۱۸۸۰ء) سے پہلے تک، جتنے بھی تذکرے لکھے گئے، ان میں سے اکثر کی زبان فارسی ہے اور فارسی "تذکرہ نگاری" ہی کی روش پر لکھے گئے ہیں۔

عربی، فارسی اور اردو کے تذکروں کی سوانح عمری پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ ابتدا میں اس فن کا مقصد، پسندیدہ اشعار کا عمدہ انتخاب ہوتا تھا، جو فنی اعتبار سے "بیاض" کہلاتا ہے۔ اسی بیاض نگاری میں رفتہ رفتہ جب نام اور تخلص کے علاوہ

ولدیت وسکونت کے ساتھ تنقیدی رائے اور کلام کی اصلاح بھی جگہ پانے لگی تو "تذکرہ" کی شکل وجود میں آئی۔ جیساکہ ڈاکٹر شارب ردولوی نے اس فن کے آغاز کے بارے میں لکھاہے:

"تذکرہ نگاری سے پہلے "بیاض نویسی" کا رواج تھا۔ لوگ شعرا کے بارے میں کچھ یادداشت نوٹ کر لیا کرتے تھے، انھیں بیاضوں پر تذکرہ نگاری کی بنیاد پڑی"

(جدید اُردو تنقید۔ اصول و نظریات، اُترپردیش اُردو اکاڈمی

تیسرا ایڈیشن، ص ۱۵۰۔ ۱۴۹)

اردو میں تذکرہ نگاری کو ترقی دینے میں دیگر کئی اسباب کے علاوہ، شعرا کی معاصرانہ چشمکوں، باہمی رقابتوں، گروہ بندیوں اور جانب داریوں نے بھی حصّہ لیا۔ اس طرح کی ایک نمایاں مثال، میرؔ کے "نکات الشعرا" (۱۱۶۵ھ) کے جواب میں، خاکسار کا تذکرہ "معشوقِ چہل سالہ" اور شیفتہ کے "گلشن بے خار" (۱۲۵۰ھ) کے مقابلے میں، باطن کے تذکرہ "گلشن بے خزاں" (۱۲۶۱ھ) کی موجودگی ہے۔ چنانچہ پروفیسر عبداللہ نے اس طرح کی معرکہ آرائیوں کا ذکر کرتے ہوئے متأسفانہ انداز میں لکھا ہے:

"ہماری تذکرہ نویسی کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس میں شاعری کی طرح "جوابیہ" کتابوں کی کثرت ہے۔"

(شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، مکتبہ جدید، لاہور، پہلا ایڈیشن۔ ص ۱۱)

اُردو میں، بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے علاوہ، مشاعروں نے بھی "تذکرہ نگاری" کی روایت کو آگے بڑھایا اور محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" (جسے فنی نقطۂ نظر سے اکثر ناقدین نے "تاریخِ ادب" میں شمار کیا ہے) تک اس کا سلسلہ قائم رہا اور اس کے بعد بھی "تذکرہ" کے نام سے "گلِ رعنا" مؤلفہ عبدالحی اور دیگر مؤلفین بھی لکھتے رہے، لیکن یہ فنی اعتبار سے (بہ استثنائے چند) یہ "تاریخ ادب" ہی میں شمار ہوتے ہیں۔

اُردو کے ان قدیم تذکروں کے مطالعہ سے تذکرہ نگار کے مزاج، تبحّرِ علمی، اندازِ تحریر، ماحول عہد اور مقامیت کے انفرادی اور اجتماعی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان تذکروں کو مواد، زبان اور مقاصد کے اعتبار سے بھی اور کئی خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے، اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے نظریے

کے مطابق :-

"اگر ہم معنوی اعتبار سے ان تذکروں کی خصوصیات پر غور کریں تو یہ ساری تقسیمیں، بُنیادی طور پر، صرف دو[۲] گروہوں میں ضم ہو جاتی ہیں۔

۱۔ بیاضی تذکرے، جن کا اصل مقصود، انتخاب اشعار ہے اس ذیل میں اردو شعرأ کے اکثر تذکرے آجاتے ہیں۔

۲۔ سوانحی تذکرے جن میں شعرأ کے حالات جمع کرنے اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً "گلزار ابراہیم"، "طبقاتِ شعرائے ہند" "شمیم سخن" "گلشن ہند" "گلستانِ سخن"۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔"

(نگار، تذکروں کا تذکرہ نمبر، مؤلفہ و مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، بابت مئی و جون سنہ ۱۹۶۴ء ص ۲۹)

یہ تقسیم، اصولی اور منطقی نہیں ہے۔ اول الذکر، کو ہم موضوع کے اعتبار سے "بیاض" ہی میں شمار کریں گے یہ تقسیم محض آسانی کے لئے کی گئی ہے۔

ہمارے ادب میں اُردو شعرأ کے ان تذکروں کو ادبی تاریخ و تنقید کے علاوہ کئی ایک اعتبارات سے بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان تذکروں کا مطالعہ ایک خاص نقطۂ نظر کا متقاضی ہے، ان قدیم تذکروں کو آج کے جدید، تنقیدی معیارات اور رجحانات کی کسوٹی پر دیکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ انھیں اسی خاص فضا اور ادبی ماحول کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے جس میں یہ لکھے گئے ہیں۔ یوں تو ان میں موجود بعض خامیاں بھی نظروں میں کھٹکتی ہیں، مثلاً اکثر تذکرہ نگاروں نے سوانح اور شاعر کے انداز سخن گوئی سے متعلق اظہار کا تقریباً ایک ہی جیسا طریقہ اپنایا ہے۔ شاعروں کے حالات قلمبند کرنے میں سنہ پیدائش اور وفات، عمر اور عہد کو یا تو نظر انداز کر دیا ہے یا صحیح طور پر توجہ نہیں دی ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ایک شاعر کے کلام (اشعار) کو دوسرے شاعر سے اور بعض اشعار کو، کئی کئی شاعروں سے منسوب کر دیا ہے۔ ان میں تقلیدی رنگ زیادہ اور انفرادی طرز نگارش کم ہے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے اپنے معاصرین و محارفین کی تعریف و توصیف میں ذاتی معاملات کو بھی ملوث کر دیا ہے۔ ایسی خامیاں سبھی تذکروں میں نہیں ہیں، بعض تذکرے

اس کے برعکس بھی ہیں، جن میں شعرا کے حالاتِ زندگی کو نہایت احتیاط کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، اور شعرا کی ولدیت وسکونت کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے اساتذہ اور تلامذہ کے ناموں کی وضاحت کے علاوہ، سنین پیدائش و وفات کے اندراج کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ لگے ہاتھوں شعرا کے ادوار قائم کرتے ہوئے ہر دور کی شاعرانہ خصوصیات بھی اُجاگر کر دی ہیں۔ ایسے تذکروں میں "گلزارِ ابراہیم" "گلشن ہند" اور "گلستانِ سخن" وغیرہ شمار کئے جا سکتے ہیں اور تنقیدی آرا کے سلسلہ میں "نکات الشعرا" "تذکرہ شعرائے اردو"، "گلشن بے خار" "تذکرہ" اور "تاریخ ادب" کی درمیانی کڑی "آبِ حیات" خاص طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں (یہاں اس بات کی وضاحت نامناسب نہ ہوگی کہ "آبِ حیات" کے آرا کو من وعن قبول کرنے سے پہلے اس کے متعلقہ، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مطالعہ ناگزیر حیثیت رکھتا ہے)

میر کا "نکات الشعرا" اردو کا پہلا تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے جو ١١٦٥ھ میں قلمبند کیا گیا، اس سے قبل "تذکرہ امام الدین" "تذکرہ خانِ آرزو" اور "تذکرہ سودا" کے لکھے جانے کا دوسرے تذکروں میں ذکر تو ملتا ہے لیکن دستیاب نہیں ہیں۔ اسی دور کے دو اور تذکرے "گلشن گفتار" حمید اورنگ آبادی اور تحفۃ الشعرا افضل بیگ قاقشاں کے ہیں جو دکن سے متعلق ہیں اور یہ اردو کے اولین تذکروں میں شمار ہوتے ہیں۔

میر نے یہ تذکرہ (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) فارسی میں لکھا ہے۔ خاتمہ میں انھوں نے ریختہ کے اقسام اس کی خصوصیات، لب ولہجہ اور شعری محاسن ومعائب کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ میر کے یہ خیالات اردو شاعری کی تنقیدی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ میر نے کوئی ایک سَو شعرا کا ذکر کیا ہے جن میں بیدل، سراج، سودا اور افضل جیسے اہم اور نامور شعرا بھی شامل ہیں۔ (امیر خسرو کا ذکر آگے کیا جائے گا) اردو کے دیگر اہم تذکروں میں "چمنستان شعرا" اور "تذکرہ شعرائے اردو" بھی خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں (ثانی الذکر کے متعلق تھوڑی سی وضاحت اوپر بھی کی جا چکی ہے) اول الذکر، تذکرہ، رائے لچھمی نرائن شفیق کا ہے جو ١١٧٥ھ میں فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے دو سَو چودہ ٢١٤، ریختہ گو شعرا کا تعارف کرایا ہے۔ اس میں شعرا کی فہرست حروفِ تہجی کے بجائے حروفِ ابجد کے لحاظ سے ترتیب دی ہے۔ اشعار کے انتخاب

ہیں اور اشعار کو صاحبان کلام سے منسوب کرنے میں احتیاط سے کام لیا ہے۔ شعرا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی اعتدال پسندی سے کام لیا ہے اور کلام کی اصلاح کرتے ہوئے کہیں کہیں متبادل مصرعے بھی دے دیئے ہیں۔

میر حسن نے "تذکرہ شعرائے اردو" ۱۱۸۸ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان مرتب کیا۔ انھوں نے بھی یہ تذکرہ فارسی میں لکھا ہے، اور شعرا کی فہرست بہ لحاظ حروف تہجی بنائی ہے۔ نام کی ہر ردیف میں شاعروں کو تین خاص گروہوں، متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں تقسیم کیا ہے۔ دوسروں کے برخلاف، بے جا تعریف و تنقیص سے احتراز کرتے ہوئے حفظِ مراتب کا بھی پاس و لحاظ رکھا ہے جس سے ان کے ذوق سخن کی سنجیدگی اور بے لاگ تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے

تذکروں کی ایک بڑی اہمیت ان میں موجود، تنقیدی شعور اور رجحان کی بھی ہے۔ تذکروں میں "تنقید" کا جائزہ لینے سے قبل اس بات کی وضاحت نامناسب نہ ہوگی کہ بہ قول پروفیسر عبد اللہ تذکرہ، تنقید کا متبادل لفظ نہیں ہے۔ اس لیے تذکروں کے تنقید کے مطالعہ کے سلسلے میں تنقید کو اسی عہد کے تنقیدی بصیرت تک محدود رکھنا چاہیئے۔ ان میں تنقید کو وسیع معنوں میں تلاش کرنے سے مایوسی اور کلیم الدین احمد کی طرح گمراہی کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ جیسا کہ تذکروں میں موجود تنقیدی مواد کے متعلق ان کی رائے ہے:-

> "تنقید کی ماہیت، اس کے مقصد اور اس کے صحیح اسلوب سے تذکرہ نویس واقفیت نہ رکھتے تھے ... ان تذکروں کی اہمیت تاریخی ہے۔ ان کی دنیائے تنقید میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تاریخی اہمیت اور تنقیدی اہمیت میں مشرقین کا فرق ہے۔"
>
> (اردو تنقید پر ایک نظر، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ تیسرا ایڈیشن، ص ۲۹-۲۸)

کلیم الدین احمد کی یہ رائے، مشرقی اصول انتقادیات سے عدم واقفیت اور اپنی انتہاپسندی کی غمازی کرتی ہے، جس طرح وہ، اردو ادب سے متعلق اکثر و بیشتر اس طرح کے بر خود غلط نظریات قائم کرتے رہتے تھے، اسی طرح ان کی یہ رائے بھی قابل اعتنا نہیں ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ آج جدید تنقید میں ایک بات کو کئی کئی جملوں اور سطروں میں بیان کیا جاتا ہے۔ اسے تذکرہ نگار

جملوں میں سمو دیتا تھا۔ ان میں تنقید سے متعلق چند الفاظ یا چھوٹے چھوٹے فقرے اور جملے ملتے ہیں مثلاً "قادر سخن"، "صاحب کمال"، "نکتہ پرداز"، "بسیارِ خوش فکر"، "تشبیہات تازہ"، "مضامین غریب" وغیرہ، اسی طرح تبصرہ بھی نہایت مختصر ہوتا ہے جیسے، "کلامش از چاشنی درد خالی نیست" "از کلامش بوئے دل سوزی و شیدائی می آید" وغیرہ اور "نکات الشعرا" میں کسی شاعر سے متعلق، "شاعر پر زور"، "آب و رنگ باغ نکتہ دانی چمن آرائے گلزار معانی"، "متصرف ملک روز"، "طلب بلاغت"، "شاعر زبر دست"، "قادر سخن"، "صاحب کمال"، "بے نظیر"، "ذی علم"، "نکتہ پرداز"، "بذلہ سنج"، "ہمیشہ خندہ و شگفتہ رو"، "بسیار خوش فکر"، "تلاش لفظ تازہ" یہ ترکیب نما اوصاف و اصطلاحات ہر ایک اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ اسی طرح تذکرہ نگار جو تنقیدی الفاظ و اصطلاحات استعمال کرتا تھا، ان کا ایک وسیع پس منظر ہوتا ہے، اور یہ اپنے اندر گہری معنویت رکھتے ہیں، لہٰذا کلیم الدین احمد کے اظہار کردہ آرا کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا جانا چاہیئے کہ ؎

سرسری تم جہاں سے گذرے ٭ ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اُردو کے تذکرہ نگاروں کا تنقیدی نقطۂ نظر بعض عربی نقادوں کے نظریات پر مبنی ہے جو بہ نسبت معانی کے الفاظ پر زور دیتے ہیں (اس نقطۂ نظر کا مقصود، معانی کی مکمل ترین ترسیل بھی ہے) اور ادائے معانی کو حسب موقع نئے نئے اسالیب میں جلوہ گر کرنے کے آداب سے بحث کرتے ہیں، اسی بنا پر، اس تنقیدی دبستان میں "حُسن الفاظ" کی بڑی اہمیت ہے، اسی لفظی تنقید نے "مکمل فن بلاغت" کا درجہ حاصل کر لیا، جس میں علم معانی و بیان کے وہ تمام اجزا اور لوازم شامل ہو گئے ہیں، جنھیں صنائع لفظی و معنوی، استعارات و تشبیہات، مجاز و کنایہ ردیف و قافیہ اور بعض لسانی و لغوی تشریحات و توضیحات کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ پورا دبستان اردو میں بھی کارفرما رہا ہے۔ تخلیق و تنقیدِ شعر کو عربی ہی کی طرح ذوقی اور وجدانی چیز سمجھا جاتا تھا اردو ادب میں تذکرہ نگاری کے دور میں عصر حاضر کے برعکس عربی و فارسی ہی کی طرح تنقید کے محور زیادہ تر، موضوع اور مواد کی بجائے، ہیئتِ الفاظ اور علم بیان علم معانی و بدیع کے لوازم پیش نظر ہوتے تھے اس لیے اردو تذکروں کے مطالعے کے وقت، مشرقی تنقید کا یہ پس منظر، اور لفظی و معنوی تنقید کے ان اصول و ضوابط کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے ان قدیم تذکروں کو

قدیم "فن نقد" کی روشنی میں دیکھیں تو انتہائی اختصار و ایجاز کے باوجود تنقیدی مواد کی فراوانی ملیگی۔

تذکرہ نگاروں نے زیادہ تر صحتِ زبان، محاورات، صنائع کا استعمال، متروکات، فصیح و غیر فصیح الفاظ اور ترکیبیں، ابہام اور دوسرے نقائص اور محاسن شعری پر روشنی ڈالی ہے، اس مشرقی انداز تنقید میں ان کا ذوقِ سخن، سلیقۂ شعری کے اور، اُردو اور فارسی اساتذہ کے کلام کا مطالعہ اور وجدان، ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ بالخصوص میر حسن کے تذکرے "تذکرۂ شعرائے اردو" میں یہی رجحان غالب ہے۔ شعرا کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اس بات پر خاص توجہ دی ہے کہ زبان کے استعمال کے لحاظ سے کس کا کلام زیادہ فصیح ہے، اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو اور فارسی، شعرا کا تقابلی جائزہ بھی لیا ہے۔ میرؔ، گردیزی، قاسمؔ اور شفیق وغیرہ کے یہاں، دوسرے تذکرہ نگاروں کی بہ نسبت زیادہ اور گہرا تنقیدی شعور ملتا ہے۔ تذکروں کے متعلق کلیم الدین احمد کا یہ کہنا کہ " ان تذکروں کی اہمیت محض تاریخی ہے، یہ دنیائے تنقید میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے"۔ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

تذکروں میں تنقید کی نوعیت پر روشنی ڈالنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ پہلے ہم عربی نقد کے بعض اصطلاحات کا عصرِ حاضر کی تنقیدی کتابوں میں کی گئی تعبیرات سے آگہی حاصل کریں۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجائے گی کہ مشرق کا سرمایۂ نقد، مغرب کے مقابلہ میں اتنا بے وقعت اور کم مایہ نہیں ہے جتنا کہ بعض انتہاپسندوں اور مشرقی علوم سے ناواقفوں نے بیان کیا ہے

مشہور زمانہ مایۂ ناز عالم ابنِ خلدون نے علم بیان کی اقسام اور ان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

علمِ بیان[1] کی تین قسمیں ہیں۔ جس علم میں ان ہیئتوں اور حالتوں سے بحث کی جاتی ہے، جو الفاظ کے ساتھ مقتضیٰ حال کے مطابق ہوں اسے علم بلاغت کہتے ہیں۔ دوسرا علم وہ ہے جس میں لفظی لازم اور اس کے ملزوم سے بحث کی جاتی ہے، لیکن استعاروں اور کنایوں وغیرہ کا بیان ہوتا ہے اسے علم بیان کہتے ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے جس سے کلام

---

[1] مقدمہ ابن خلدون اردو ترجمہ راغب رحمانی دہلوی حصہ دوم ص ۴۷۸

میں زینت و حسن پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے اور کسی نہ کسی قسم کی خوبصورتی پیدا کی جاتی ہے۔"

ایک عرب اہلِ قلم نے عربی نقد کے اہم ستونوں کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"... التی یطابق بها الکلام مقتضی الحال (وهی مانسمیه بعلم المعانی) وعن أوجه استعمال اللفظ بطرق مختلف الدلالة باختلاف لوازمه (وهی ما نسمیه علم البیان) وعن الأسالیب الجملة وأنواع المحسنات اللفظیة والمعنویة (وهوما نسمیه علم البدیع)..."

احمد الاسکندری، تاریخ آداب اللغة العربیة ... ص ۹۸

پروفیسر عابد علی عابد نے علم معانی کی تعریف اس علم کی غرض و غایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا ہے جو اس سے بھی زیادہ جامع اور مکمل ہے، اس کا ذکر آئندہ سطروں میں ہوگا۔

کبھی ان میں سے ہر ایک کو جداگانہ حیثیت سے دیکھا گیا ہے اور کبھی تینوں کو "علم البیان" یا "علوم البلاغة" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

جہاں تک عربی تذکروں میں اصول انتقاد کے وجود کا مسئلہ ہے اس پر اردو میں بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ابتدائی اور اولین تذکروں میں ایسی بلند فکری، گہرائی اور گیرائی کے نمونے ملتے ہیں جو آج کے تقاضوں اور عربی تنقید میں ناگزیر اصولوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ عربی کے اولین "طبقات" میں موجود اس نکتہ پر غور کیجئے۔ ابن سلام نے لکھا ہے (یہ گفتگو کی شکل میں ہے)

"... خلف سے کسی نے کہا کہ جب میں ایک شعر سنتا ہوں اور اس کو پسند کرتا ہوں تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ جو تم کہتے ہو یا تمہارے ساتھی کہتے ہیں اس کی پروا کروں؟ خلف نے اس کا جواب دیا کہ اگر تم کو ایک درہم ملے اور وہ تم کو پسند آئے، لیکن ایک صراف اس کو دیکھ کر کہے کہ کھوٹا (کھوٹا) ہے تو پھر تمہاری پسند تمہیں کیا فائدہ پہنچائے گی...؟"

(مقالہ، عربی تنقید کے بنیادی افکار، مشمولہ، تنقید کے بنیادی مسائل، ص ۳۳)

یہ اصول تحقیق و تنقید دونوں میں آج بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے، کسی متن کو مدون کرنے،

کسی نظم و نثر کے فن پارہ پر، اظہار خیال کرنے سے پہلے ہمیں اس کے کھرے یا کھوٹے ہونے کی تمیز کرنی ہوتی ہے اصل خالق کے علم و عرفان کے بعد ہی دوسرا مرحلہ طے کیا جاتا ہے، ورنہ ساری عمارت منہدم ہو جائے گی۔

ادب میں قدیم و جدید کی برتری کا مسئلہ اکثر زیر بحث رہا ہے اس معاملہ میں ابن قتیبہؒ نے بڑی وسیع النظری اور حقیقت بینی کا ثبوت دیا ہے، کہتے ہیں :-

(الشعر والشعراء ۔ جزء اول، مطبع دار الثقافۃ، بیروت، دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۶۹ء، ص ۱۰)

"مفہوم ہے، نہ میں نے متقدمین کو تقدم کی بنا پر بزرگی کی نظر سے دیکھا ہے اور نہ متاخرین کو تاخر کی وجہ سے حقارت کی نظر سے بلکہ دونوں کو میں نے انصاف کی نظر سے دیکھا ہے، اور ہر ایک کو میں نے اس کا پورا پورا حق دیا ہے ... اللہ تعالیٰ نے شعر علم اور بلاغت کو صرف کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص تو نہیں کر دیا ہے، بلکہ یہ تو ہر زمانہ کے لیے اپنے بندوں میں مشترکہ طور پر تقسیم ہوتی ہے۔"

اس طرح کے بنیادی نکات، فارسی اور اردو کے تذکروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ نکات عربی زبان کے حقیقی اصول نقد کے ماسوا ہیں۔ پروفیسر عابد علی عابد نے مشرق کے حقیقی اصول تنقید کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"... عربی فارسی اور اردو میں قدیم اسلوب انتقاد کے مطابق ادبیات کو جانچنے اور پرکھنے کا دار و مدار اصلاً تین علوم پر ہے، یعنی علم معانی بیان و بدیع ..."

(اصول انتقاد ادبیات، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم، ص ۱۴۸)

اور علم معانی کے متعلق لکھتے ہیں :-

"... علم معانی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ وہ علم ہے جس سے مدد لے کر ادیب اور انشا پرداز، الفاظ کو ان کی دلالت وضعی کے مطابق اس طرح استعمال کرتا ہے کہ مفہوم بالکل صحیح طریقے پر دوسروں تک منتقل ہو جاتا ہے اور ایسی غلطیوں سے بچتا ہے، جن کی بنا پر دوسروں کو الفاظ کی دلالت وضعی کے مطابق، ادیب کا مفہوم سمجھنے میں دقت نہ ہو ..."

(کتابِ مذکور، ص ۱۴۹)

انھیں کے مطابق علم بیان کی وضاحت حسب ذیل ہے :۔

"علم بیان، تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔"

(کتاب مذکور، ص ۱۵۴)

بدائع (لفظی و معنوی) کو اکثر مشرقی علمائے "محسنات کلام" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جہاں تک صناعت لفظی کا تعلق ہے ہمیں اس سلسلہ میں یہ اہم نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی بہت سی صنعتیں عربی زبان کی ساخت میں پوشیدہ ہیں۔ "تنسیق الصفات"، "ردالاعجاز علی الصدور" اور "تجنیس" وغیرہ کی طبعی قسمیں اسی میں شمار ہیں۔ یہ نظم و نثر دونوں میں عام ہیں، تشبیہ و استعارہ پر تو عربی کا دارومدار ہے۔ ردالعجز علی الصدر کی مثال میں قرآن حکیم کا یہ جملہ دیکھئے :۔

"وَاِذا مَرّوْ بااللغو مَرّوا کراما ..."

اس پر تکلف کا شبہ بھی نہیں گذرتا۔ "تنسیق الصفات" کی مثال میں یہ حدیث شریف ملاحظہ کیجئے۔

"کلمتانِ خفیفتانِ علی اللسانِ ثقیلتانِ فی المیزانِ
حبیبتانِ الی الرحمٰن، سبحان اللہ بحمدہٖ سبحان اللہِ العظیم۔"

اس میں تبارک و تعالیٰ کی حمد و تسبیح کے دو کلموں کی چار صفات، متواتر پیش ہوتی ہیں، لیکن اس پر تکلف کا شائبہ تک نہیں، اس قبیل کی صنعتوں کا جزوی اطلاق فارسی اور اردو پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اوپر پیش کی گئی مثالوں میں موسیقیت اور ایک خاص طرح کا غیر شعوری آہنگ آپ نے محسوس کیا رمز و ایما کی دو ایک شعوری مثالیں بھی ہم پیش کرتے ہیں۔

کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہ ہے۔ اللہ کے بارے میں قرآن حکیم میں اکثر جگہ کہا گیا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے بے نیاز ہے۔ سورۂ اخلاص میں مزید وضاحت کے ساتھ کہہ دیا گیا ہے کہ وہ تمام انسانی لوازمات سے بھی مبرّا ہے۔ سیرت کی معتبر کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نبوت سے سرفراز کئے جانے سے پہلے بھی "خدا ترس" اور پاک باز نوجوان تھے۔ کردار کے اعتبار سے "صادق" اور "امین" کہلاتے تھے۔ پوری حیاتِ مبارکہ بھی تمام آلائشوں سے پاک و صاف رہی۔ اب اسی مفہوم کو کوئی شاعرانہ ادا میں یوں بیان کر دے کہ جس طرح اللہ و محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسمائے گرامی نقطوں سے پاک ہیں اسی طرح ان ہستیوں کی ذاتِ

گرامی بھی تمام عیوب سے پاک ہے تو بات بڑی بلیغ ہو جائے گی اور یہ نکتہ آفرینیاں، ذہن انسان کو مہمیز کریں گی۔ (ہر چند کہ حروف یا اسماء کا نقطہ دار ہونا معیوب نہیں ہے)

علمِ بیان عربی ہی سے مخصوص نہیں ہے، یہ دنیا کی سبھی زبانوں میں موجود ہو سکتا ہے۔ قرآن نے اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:۔ "خَلَقَ الْاِنْسَانَ وعَلَّمَهُ الْبَيَانَ"۔ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان یعنی ادائے مافی الضمیر سکھایا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "علم بیان" دراصل انسان کے ابتدائی اور بنیادی ضرورتوں میں سے ہے، چنانچہ ابن رشیق (۴۵۶ھ) علم بیان سے متعلق گروہ علما کی حسب ذیل مجموعی رائے پیش کی ہے:۔

"وقالوا: الروح عماد الجسم، والعلم عماد الروح، والبیان عماد العلم"

(العمدہ، مرتبہ محمد محی الدین عبد الحمید طبع چہارم سنہ ۱۹۷۲ء، بیروت ج ۱، ص ۲۴۲)

یعنی بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ جسم کا ستون رُوح ہے اور رُوح کا ستون عِلم ہے اور عِلم کا ستون (علم) بیان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُردو کے اکثر و بیشتر نقاد، اردو تنقید کے بعض اہم سراغوں کی رسائی تک قاصر رہے ہیں۔ اس کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے پروفیسر عابد علی عابد نے کہا ہے:۔

بات یہ ہے کہ اُردو ادب نے عربی کے علمی ذخائر سے اور فارسی کے ثقافتی مخازن سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اردو تذکرہ نویس بھی فارسی اور عربی کے اسلوب انتقاد کی پیروی کرتے ہیں اور عصرِ حاضر کے نقاد (اِلّا ماشاءاللہ) عربی کے متعلق فقط یہ جانتے ہیں کہ اس زبان کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ فارسی ادبیات اور ادبی روایات کے متعلق ان کی معلومات ناقص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تذکروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اکثر نقادوں کے لیے رموز سربستہ کا حکم رکھتے ہیں۔ یہ نقاد اکثر ان رموز و اصطلاحات کو جو ——— تذکروں میں پائی جاتی ہیں محض عبارت آرائی پر محمول کرتے ہیں، لیکن معانی، بیان اور بدیع کے جن مباحث کا ذکر ہو چکا ہے انھیں ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تذکرہ نگاروں کی نظر کتنی گہری، مطالعہ کتنا وسیع اور فیصلہ کتنا صحیح ہے۔"

(اصول انتقاد ادبیات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۲۳۷)

میر نے نکات الشعرا میں اصلاح سخن دیتے ہوئے بار بار ربط کلام، خوش فکری، تلاش لفظ

تازہ، صفائی گفتگو، ایجادِ مضامینِ تازہ اور طرزِ خاص وغیرہ پر زور دیا ہے۔ یہی تنقیدی اشارے آج کے دور میں توضیحی شکل اختیار کرنے کے بعد ایک ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر لیے ہیں۔ ان میں کا ہر اشارہ ایک معنوی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ اشارے بے وقعت نہیں ہیں بلکہ تفصیل طلب ہوتے ہیں لیکن اس کا مطالعہ اپنے عہد کا مذاقِ سخن اور طرزِ تنقید سے واقفیت چاہتا ہے

اکثر تذکرہ نگاروں کا مقصد اپنے اپنے معاصرین شعرا کی فہرست مرتب کرنا ہوتا تھا اور بعض بالخصوص میرؔ نے شعرا کے کلام پر اصلاحیں بھی دی ہیں لیکن ان کے پیشِ نظر دیگر باتیں ضمنی حیثیت رکھتی ہیں، تنقید کی بھی یہی حیثیت تھی۔ بہت مناسب ہوگا کہ ہم تذکرہ کی ہیئت پر بھی غور کریں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر حنیف نقوی نے لکھا ہے:۔

"یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تذکرہ نویسی کا فن نہ تو براہِ راست تاریخ نگاری کے ذیل میں آتا ہے، نہ اسے فن سیرت یا سوانح نگاری کے تحت رکھا جا سکتا ہے اور نہ اس کا دائرہ کار تنقید کی طرح صرف اچھے بُرے کی پرکھ تک محدود ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ ان تمام فنون یا اصنافِ ادب کا آمیز اور بجائے خود ایک فن یا صنفِ ادب ہے۔" (شعرائے اردو کے تذکرے ص ۸۵۹)

تذکروں کے مطالعہ اور اس سے استفادہ کے وقت ہمارے ذہن میں مذکورہ امور موجود رہنے چاہئیں۔ اکثر ناقدین کا یہ کہنا کہ تذکروں کی اختصار پسندی، واقعات کو سمجھنے اور حقائق تک رسائی میں معاون نہیں ثابت ہوتی۔ یہ اعتراض یقیناً مبنی بر صداقت ہے۔ ہمارے ان اصحاب قلم نے اپنے دور کے تقاضوں ہی کو ملحوظ رکھا اور مستقبل کے بارے میں گہری توجہ نہیں دی۔ اس ایجاز و اختصار پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔ عربی کی جہاں اور بہت سی لسانی خصوصیتیں ہیں، ان میں ایجاز و اختصار بھی شامل ہیں۔ مزید برآں زمانہ قدیم سے عرب کا نظریہ رہا ہے کہ "خیر الکلام ما قلّ ودلّ" یعنی بہترین کلام وہ ہے جو مختصر اور جامع ہو، ایک مجموعی رائے یہ بھی ہے کہ "الکنایۃ افضل من التصریح" یعنی کنایہ تفصیل و وضاحت سے کہیں زیادہ بلیغ ہے۔ اس اختصار پسندی کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اس دور میں علم عام تھا۔ شعر و ادب اور دوسرے علوم و فنون اور حالات و واقعات سے واقفیت بہت عام تھی۔ ایسی صورت میں تفصیل و وضاحت یقیناً باعثِ گراں رہی ہوگی۔ چنانچہ عرب کا مشہور عالم

جاحظ (۱۵۰، ۲۵۰ھ) یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ : "احسن الکلام ما کان قلیلہ، یغنیک عن کثیرہ..." (البیان والتبیین ج ا ص ۵۹) "یعنی سب سے اچھا کلام وہ ہے جو مختصر ہو اور زیادہ سے تمہیں بے نیاز کر دے"۔

عربی میں یہ اختصار پسندی عام تھی ہی، فارسی میں بھی اس کو اپنایا گیا۔ فارسی کی ابتدائی تصنیف "چہار مقالہ" تو اس کا بے نظیر نمونہ ہے، اس پس منظر میں قدامہ بن جعفر کی یہ رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے، وہ کہتے ہیں :-

"ان الاطالۃ اکثر اسباب الملالۃ۔" (نقد النثر ص ۱)

"یعنی طوالت سب سے زیادہ ملال کا باعث ہوتی ہے"۔

عربی و فارسی میں یہ کیفیت بہت زمانہ تک برقرار رہی، اس کے اثرات اردو تذکروں پر چھائے ہوئے ہیں تذکروں سے متعلق یہ گمان بھی ہے کہ اس کا مطالعہ حقائق کی طرف رہنمائی نہیں کرتا یا اس سے خالی ہے عصر حاضر کا تقاضہ یہ ہے کہ حقائق کو طشت از بام کیا جائے لیکن ماضی میں، مشرق کی صورت حال اس سے مختلف رہی ہے، اس کے کچھ اصول و آداب ایسے تھے جن کی پیروی باعث سعادت سمجھی گئی۔ یہ آداب عام طور پر اب بھی ہماری زندگی کا ایک ناگزیر حصہ ہیں، لہذا تذکروں میں واضح سچائی، دو ٹوک انداز، یا فیصلہ کن طریق کار کا تقاضہ کرنے سے پہلے ان اخلاقی اقدار سے آگہی بھی ضروری ہے۔

عصر حاضر کے برخلاف ماضی میں "خطائے بزرگاں، گرفتن خطاست" کو ایک شائستہ اصول کی حیثیت حاصل تھی اور گلستان سعدی میں "محتسب را دروں خانہ چہ کار؟" اور "دروغ آمیز مصلحت بہ از راستی فتنہ انگیز" جیسے اقوال پوری معاشرتی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھیئے تو جس معاشرہ "ہمہ را بہ نیکی یاد کردن" کا جذبہ کارفرما رہا ہو (اس سے قطع نظر کہ فی نفسہ یہ اصول و آداب اچھے ہیں یا برے) اس سے کھلی ہوئی تنقید کی توقع رکھنا بے کار ہے۔

مشرق میں شخصی نظام حکومت اور تصوف کی تعلیمات عام ہونے کی وجہ سے ہر معاملہ میں کیا؟ اور کیوں؟ کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ حافظ کا یہ شعر ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ رسم و منزلہا

منصوفانہ، افتادِ طبع کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

عربی میں ایجاز و اختصار کے ناگزیر ہونے کے بارے میں اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کا اثر تذکروں میں دیکھئے۔ میرؔ جس وقت "نکات الشعرا" لکھ رہے تھے، اس وقت امیر خسروؔ کی شہرت سرزمین ہند سے نکل کر، عرب و ایران تک جا پہنچی تھی۔ اور ان کے حالات و واقعات کا ذکر دوسری کتابوں اور تذکروں میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ میرؔ نے جب ان کے بارے میں قلم اٹھایا تو صرف اتنا ہی لکھا کہ:-

"مجمع کمالات و صاحب حالات، فضائل او اظہر من الشمس است۔ احوال امیر مذکور در تذکرہا مسطور، نوشتن ایں احقر العباد فضولیست، اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد، دریں خود تردّدے نیست۔"[۱]

اس کے بعد یہ لکھ کر ... "از انجملہ یک قطعہ تیمناً نوشتہ آید"[۲] حسب ذیل دو شعر نمونتاً پیش کر دیئے

زر گر پسرے چو ماہ پارا — کچھ گھڑیئے سنواریئے پکارا

نقدِ دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا[۳]

(۱، ۲، ۳ نکات الشعرا، مرتبہ مولوی عبدالحق ۱۹۳۵ء طبع ثانی ص ۲)

یہ اختصار میرؔ کی سلیقہ مندی اور سلامت روی اور اصولِ بلاغت کی پاس داری کا داد چاہتا ہے اگر تفصیل لکھنے بیٹھتے تو انھیں مجبوراً دوسرے تذکروں میں موجود مواد کو دہرانا پڑتا جب کہ امیر خسروؔ، میرؔ کے عہد میں اہلِ علم میں اچھی طرح جانے پہچانے جاتے تھے۔ پہلے جملے میں ان کے اوصاف کو ظاہر کر دیا گیا ہے اور دوسرے میں نشاندہی کر دی کہ ان کے حالات تذکروں میں لکھے جا چکے ہیں (اس لیے) ہمارا لکھنا فضول ہے۔ ان کے ریختہ کی کثرت کے بارے میں بھی اشارہ کر دیا۔ شاید کلیم الدین احمد اور ان جیسے حضرات کو یہ عبارت بڑی بے معنی نظر آئے، لیکن اب اردو میں سرسری تذکرہ لکھا جائے اور اس میں غالبؔ اور اقبالؔ کے ذکر میں مجموعی طور سے اس طرح لکھ دیا جائے تو ہمارا یہ اعتراض معقول نہیں ہوگا کہ اس سے ان کی شخصیت اور شاعری پر روشنی نہیں پڑتی اسی طرح عہد میرؔ میں امیر خسروؔ کی حیثیت کو سمجھنا چاہیئے۔

تذکروں میں موجود تنقید سے واقفیت کے لیے مشرقی معیاراتِ شعر سے آگہی ایک لازمی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماضی کے اس عظیم فکری سرمایہ سے استفادہ کے بغیر ادبی تنقید کے مستقبل کی بنیاد مضبوط و مستحکم نہیں بنائی جا سکتی ہے۔

مولانا مفتی محمد داؤد مظاہری
مفتی و استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام

سوال و جواب

سوال ۱ ۔ کیا ایسا شخص امامت پر رکھنے کے قابل ہے جس میں حسب ذیل عادات ہوں؟

(۱) جھوٹ بولے (۲) سامنے چاپلوسی اور تعریف کرے پیچھے غیبت کرے (۳) گالیاں دے اور فحش کلامی کرے (۴) نماز میں دائیں بائیں دیکھے (۵) ڈاڑھی سے نماز میں کھیلے (۶) بحالت امامت ایک پیر پر کھڑے ہو کر دوسرا پیر ڈھیلا چھوڑے (۷) نماز کے لئے سستی اور کاہلی کرے۔

سوال ۲ ۔ شرعاً امام کے کیا احکام ہیں، کیسے شخص کو امام بنایا جائے؟

سوال ۳ ۔ شرعاً کسی امام سے مقتدی کو اختلاف ہو جائے تو اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

(محمد عابد الدین)

الجواب وباللہ التوفیق۔

۱ ـــــ اگر کسی شخص میں واقعۃً مذکورہ اوصاف موجود ہوں تو مستقل امام ہونا کجا اس کے پیچھے کسی ایک وقت اقتدار بھی مناسب نہیں۔ اس کی اقتدار مکروہ تحریمی ہے کیوں کہ یہ شخص فاسق ہے اور فاسق کی امامت مکروہ ہے، کما فی الھدایہ ص ۱۰۱۔ نیز حدیث شریف میں ہے لا یؤم فاجر مؤمناً۔ یعنی فاسق و فاجر کسی مؤمن کا امام نہ بنے۔ اور اگر کوئی اس قسم کے شخص کو مقرر کرے یا ذریعہ بنے تو وہ بھی گناہگار ہے۔ (کبیری ص ۴۷۹۔ از فتاویٰ رحیمیہ ص ۱۷۵) اور حدیث میں ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جو شخص کسی جماعت میں امامت کی ذمہ داری کسی شخص کے سپرد کرے اور اس جماعت میں اس سے بہتر شخص موجود ہے جو اللہ کی رضامندی حاصل کرنیوالا ہے اور اللہ کے حکم کی زیادہ تعمیل کرنیوالا ہے تو اس نے اس غلط انتخاب سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی، نیز تمام مسلمانوں سے خیانت کی من قلد رجلا علی عصابة وھو یجد فی تلک العصابة من ھو ارضی للہ فقد خان المؤمنین (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱۰۸ ج ۱ از فتاویٰ رحیمیہ ص ۱۶ ج ۱) اسی طرح ایک اور حدیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اذا ام الرجل وفیھم من ھو خیر منه لم یزالوا فی سفال (جب قوم کی امامت ایسا شخص کرے کہ اس کے پیچھے بہتر

شخص موجود ہے تو وہ قوم ہمیشہ پستی میں رہے گی۔ بحوالۂ مذکورہ) ایک امام تو کجا، عام انسان کو بھی مذکورہ اخلاق رذیلہ اور گندے اوصاف سے پاک اور صاف رہنا ضروری ہے، اس میں بعض تو گناہ کبیرہ ہیں، جھوٹ تو ہلاک کرنیوالا ہے اور دنیا میں رسوا کرنے والی ہر برائی کی جڑ ہے اس لئے کہا گیا ہے الصدق ینجی والکذب یھلک۔ یہ تو کبائر میں بھی شنیع ترین گناہ ہے، ایسا شخص فاسق و فاجر اور بدگو لوگوں میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح غیبت بھی عظیم ترین گناہ ہے، قرآن شریف میں ارشاد ہے ولا یغتب بعضکم بعضاً کہ آپس میں ایک دوسرے کی غیبت مت کرو، کیا تم میں کوئی یہ بات پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، یقیناً تم اس کو ناپسند کروگے، نیز غیبت سے ایک مسلمان بھائی کی آبروریزی ہوتی ہے جو زنا جیسے بدتر گناہ سے بھی بڑھ کر گناہ ہے اس لئے ایسا آدمی یقیناً فاسق و فاجر ہے جب تک توبہ نہ کرے امامت کا حقدار ہی نہیں ہوگا، گالی گلوچ اور فحش کلامی غیبت ہی کی شاخوں میں سے ہے، اسی طرح نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا، ڈاڑھی سے کھیلنا یہ تمام چیزیں آدابِ نماز کے خلاف ہیں جس سے نماز میں کراہت ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر اِدھر اُدھر دیکھنے میں سینہ قبلہ سے پھر جائے یا کثیر عمل ہوجائے تو نماز فاسد ہوجائے گی، یہ تو ایک عام نمازی کو زیب نہیں دیتا چہ جائیکہ امام سے اس قسم کی باتیں سرزد ہوں۔

۲ــــــ امام متقی اور پرہیزگار ظاہر میں گناہ اور برائیوں سے بچنے والا ہو جیسا کہ حدیث میں ہے عن ابن عمرؓ مرفوعاً اجعلوا ائمتکم خیارکم فانه وفدکم فیما بینکم وبین ربکم رواہ البیھقی بسندٍ ضعیفٍ وفی روایۃٍ ان سرکم ان تقبل صلوتکم فلیؤمکم علمائکم فانھم وفدکم فیما بینکم وبین ربکم رواہ الطبرانی وفی روایۃ الحاکم فلیومکم خیارکم۔ (تم لوگ اپنا امام اپنے میں سب سے بہتر کو بناؤ کہ وہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ترجمان ہے اور ایک روایت میں ہے اگر تم کو خوش کرے یہ بات کہ تمہاری نماز قبول کی جائے تو تمہیں چاہیئے کہ امام علماء متقی میں سے چنو کیوں کہ علماء تمہارے اور رب کے درمیان قاصد ہیں اور ایک روایت حاکم کی ہے کہ تمہاری امامت تم میں سب سے بہتر آدمی کرے۔

ــــــــــــــــ (منقول از فتاویٰ رحیمیہ ص۱۷۵ مع تفسیر)

فقہ حنفی کی ایک مشہور کتاب "نورالایضاح فقہ" میں درج ذیل اوصاف کے حامل کو امامت کا سب سے زیادہ حقدار قرار دیا گیا ہے۔ عبارت یہ ہے: فالاعلم احق بالامامۃ ثم الاقرأ ثم الاورع ثم الاسن ثم الاحسن خلقا ثم الاحسن وجھا ثم الاشرف نسباً ثم الاحسن صوتاً ثم الانظف ثوباً امامت

کا زیادہ حقدار وہ ہے جو دین کے احکام کو یا کم از کم نماز کے احکام کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو پھر وہ جو تجوید میں زیادہ ماہر ہو، پھر وہ جو زیادہ متقی ہو پھر وہ جو عمر میں بڑا ہو پھر وہ جو سب سے اچھے اخلاق والا ہو پھر وہ جو باوجاہت خوبصورت ہو، پھر وہ جو نسباً زیادہ شریف ہو پھر وہ جس کی آواز اچھی ہو پھر وہ جو زیادہ صاف ستھرا اور پاکیزہ کپڑے پہنا ہو)۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص ان اوصاف میں جتنا زیادہ بڑھا ہوا ہے اتنا ہی وہ حقدار ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو آگے بڑھانا مناسب نہیں۔

۳ـــــــ اگر کسی شخص کو بعض شرعی امور ضروریہ کی خلاف ورزی کی وجہ سے امام سے اختلاف ہو تو ایسے شخص کو چاہئے کہ اور جگہ نماز پڑھے کیوں کہ اس کے علم میں یہ تمام چیزیں ہیں اس لئے اقتدار مکروہ ہوگی، البتہ ان عیوب کی تشریح تمام مقتدیوں کے سامنے بلاوجہ تحقیر کی غرض سے نہ کرے بلکہ اس کی عزت ریزی سے بچتے ہوئے تنہائی میں اس کو سمجھائے۔ ہاں اگر وہ باز نہیں آتا ہے اور ہٹ دھرم ہے اور اپنی غلطیوں پر مصر ہے تو ان امور کو مقتدیوں کے علم میں لانا اور اس کی مناسب تادیب کرنا درست اور مناسب ہے۔ هٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

ولیمہ و چوتھی کی دعوت

(۱) ولیمہ کی دعوت کھانا کیسا ہے؟ (۲) چوتھی کی دعوت کے متعلق کیا حکم ہے؟ (۳) بعض احباب ولیمہ اور چوتھی مشترکہ طور پر کرتے ہیں کہ دُلہا اور دُلہن والے نصف نصف رقم شریک کر کے دعوت کرتے ہیں تو یہ دعوت ولیمہ کی تعریف میں آئیگی یا چوتھی میں؟ (۴) اگر چوتھی کی دعوت جائز یا مناسب نہیں ہے تو کیا چوتھی اور ولیمہ کی مشترک دعوت میں شرکت کی جاسکتی ہے؟۔

ـــــــــــــــــ (عبدالمجید خاں)

الجواب:۔

۱ـــ ولیمہ کی دعوت احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور مسنون ہے اور بعض فقہاء نے استطاعت کی صورت میں واجب فرمایا ہے، اس کی دعوت قبول کرنا اور اس میں شرکت بھی مسنون ہے جب کہ وہاں منکر اور خلافِ شرع امور نہ ہوں۔

۲ــــ چوتھی کا کھانا آجکل صرف شہرت اور ریاء کے طور پر کیا جاتا ہے اور اس کو فخر کا ذریعہ بنالیا گیا ہے اس لئے درست نہ ہوگا کیوں کہ ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے طعام یوم الثالث سمعة (مشکوٰۃ ص ۲۷۹/۲) البتہ اپنے پاس آئے ہوئے مہمانوں کے لئے عقد کے دن ہی دلہن والوں کی طرف سے اگر انتظامِ طعام ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔

۳ــــ دونوں کا اشتراک اسی وقت درست ہے جبکہ دلہن والے صاحبِ استطاعت، خود اپنی مرضی سے شریک ہوں اور دولہے والے غریب تو بطور تعاون کیا جانا درست ہے۔ نیز آجکل اس کا رواج ہو گیا ہے کہ دونوں مل کر اس طرح کی دعوت کرتے ہیں اور اس میں باہم فخر و مباہات کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، کبھی نوبت ایک دوسرے پر طعن و تشنیع تک آجاتی ہے، یہ صورت درست نہیں ہے۔

۴ــــ اگر یہ اشتراک فخر و مباہات کا ذریعہ ہو یا سمعہ و شہرت کے لئے ہو یا دعوت میں منکرات ہوں جیسے تصویر کشی وغیرہ تو شریک نہ ہونا چاہیے۔

فیملی بنیفیٹ کا شمار ترکہ میں ہے۔

زید کا انتقال ہو چکا ہے اس کے ورثاء میں تین لڑکے دو لڑکیاں اور بیوی ہیں جو بقیدِ حیات ہیں۔ زید مذکور محکمۂ حیوانات میں سرکاری ملازم تھا۔

(۱) گورنمنٹ قانون کے اصول سے ہر ملازمِ گورنمنٹ کو بطور انعام بعد اختتامِ مدتِ ملازمت تنخواہ کے اعتبار سے گریجویٹی کی رقم ملا کرتی ہے (۲) اسی طرح سے ایک رقم فیملی بنیفیٹ کے عنوان سے (یہ رقم ماہ بماہ ملازم گورنمنٹ کی تنخواہ سے جمع کی جاتی ہے) رقم پوری جمع ہو یا نہ ہو، دورانِ ملازمت انتقال پر مبلغ (۱۰۰۰۰) دس ہزار روپئے ملتے ہیں اور اگر سرکاری ملازم بحسن و خوبی مدت ملازمت پوری کرتا ہے تو ناگہانی صورت میں ان رقومات کے حصول کے لئے کسی بھی شخص کو نامزد کرنا پڑتا ہے مثلاً بیوی، فرزند وغیرہ۔ اگر ایسی ناگہانی صورت نہیں پیش آئی تو ملازم سرکار خود ہی بعد تکمیل مدتِ ملازمت حاصل کرتا ہے۔ مرحوم زید نے جائیداد میں ایک مکان اور گریجویٹی اور فیملی بنیفیٹ کی رقم ساڑھے سترہ ہزار (۱۷۵۰۰) مرتے وقت چھوڑی ہے جس کو نامزد کردہ شخصیت (بیوی) نے گریجویٹی اور فیملی بنیفیٹ کی رقم حاصل کرلیا ہے۔ ــــــــ اب (۱) کیا فیملی بنیفیٹ اور گریجویٹی کی رقم زید مرحوم کے ترکہ میں شامل

ہوکر زید کے ورثاء میں حسب سہام تقسیم ہوگی۔ (۲) ورثاء میں سے اگر کوئی وارث یہ استحقاق جتائے کہ میں نے مرحوم اور اس کے افراد خاندان کی کفالت میں دیگر ورثاء کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ بوجھ اٹھایا ہے اور یہ ثابت بھی ہوجائے تو کیا متروکہ سے اس کی پابجائی کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے؟ (۳) زید کا بیٹوں کے حق میں یا کسی بھی وارث کے حق میں بطور خاص وصیت کرنا کیا درست ہوسکتا ہے؟ (۴) رقومات مذکورہ کے حصول کے لئے نامزد کردہ شخصیت کی حیثیت وکیل کی ہوگی یا کیا؟ براہ کرم مذکورہ بالا امور کی وضاحت کے ساتھ ترکہ کے تقسیم کی صورت تحریر فرماکر عنداللہ ماجور ہوں گے۔ ——— (محمد عبدالقیوم حسین)

الجواب:-

(۱) فیملی بنیفیٹ اور گریجویٹی کی رقم زید مرحوم کا ترکہ شمار ہوکر تمام ورثاء میں حسب بیان شرعی تقسیم ہوگی۔ (۲) اگر کسی وارث نے مرحوم کی زندگی میں مرحوم پر ماہانہ کچھ خرچ کیا ہو تو وہ تبرع اور احسان ہے اس کو استحقاق کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔ ہاں اگر مرحوم اپنی زندگی میں کچھ جائیداد اس کے حوالے کردیتے تو وہ ترکہ میں شمار نہ ہوتی۔ (۳) حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا وصیۃ لوارث وصیت وارث کیلئے نہیں ہوسکتی۔ لہذا سوال میں مذکورہ شکل معتبر نہ ہوگی، اگر وصیت کی جائے تو نافذ نہ ہوگی۔ (۴) فیملی بنیفیٹ اور گریجویٹی میں نامزد کردہ شخصیت کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وکیل کی ہوتی ہے لہذا مذکورہ رقم مرحوم کے ترکہ میں شمار ہوگی۔

مرحوم کا ترکہ مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جائے بشرطیکہ مرحوم پر قرضہ نہ ہو اور غیر وارث کو وصیت نہ کی ہو: ——— اگر مرحوم کے والدین مرحوم کے انتقال کے بعد باحیات نہ رہے ہوں تو مرحوم کے ترکہ کے چونسٹھ ۶۴ حصے کیے جائیں جس میں سے آٹھ ۸ حصے بیوی کو اور سات ۷ حصے ہر لڑکی کو اور چودہ ۱۴ حصے ہر لڑکے کو دیئے جائیں ——— ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

وراثت کا ایک مسئلہ

زید کا انتقال ۱۹۵۸ء میں ہوا اور زید کی بیوی کا انتقال بعد میں ہوا، دونوں کے انتقال کے بعد جائیداد کی تقسیم ہنوز نہیں ہوئی۔ زید کے ورثاء میں حسب ذیل وارث ہیں: دو ۲ لڑکے، چار ۴ لڑکیاں۔ زید کی زندگی میں دو لڑکے اور تین لڑکیوں کی شادی ہوچکی۔ ایک لڑکی کی شادی زید کے انتقال کے بعد دو بھائیوں

نے کی۔ جائیداد کی تقسیم ہنوز عمل میں نہیں آئی اب لڑکیوں نے ترکہ کا مطالبہ کیا ہے۔ جائیداد کاشت کی زمینات ہیں اور مکان ہے۔ کاشت سے دونوں لڑکے مستفید ہوتے رہے۔ جانور بھی تھے جو نہ معلوم کیا ہوئے۔ اب جب کہ ترکہ کا مطالبہ لڑکیوں کی طرف سے ہوا اور انتقال کے وقت سے ترکہ کا مطالبہ کیا گیا تو یہ جواب ملا کہ تھی، آمدنی میں سے کچھ نہ ملے گا، جس تاریخ سے ترکہ کا مطالبہ ہوا ہے اسی تاریخ سے آمدنی میں سے حصہ دیا جائے گا آمدنی سے کچھ نہیں ملے گا۔ شرعی تصفیہ سے مطلع فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:۔

اگر دونوں بھائیوں نے اپنی بہن کی شادی کا خرچ لینے کے ارادہ سے کیا ہے تب تو جو حصّہ ترکہ میں اس شادی کی گئی بہن کو ملے گا اس میں سے لے سکتے ہیں اور اگر بلا کسی ارادہ کے کیا ہے تو تبرع اور احسان ہے۔ اس کا بدلہ آخرت میں انداز سے ملیگا مگر دنیا میں نہیں لیا جاسکتا، سابقہ آمدنی کا استعمال اگر لڑکوں نے صرف اپنے اوپر کیا تو اس میں جو حصّہ لڑکیوں کا نکلتا ہے وہ دینا ضروری ہوگا اور موجودہ جائیداد میں شرعاً جو حصّہ ہر ایک کا ہوگا وہ سب کو ملیگا۔ کل جائیداد کے آٹھ حصّے کیۓ جائیں، مرحوم کا قرض ہو تو ادا کرنیکے بعد وصیت کی ہو تو تہائی مال سے جاری کرنیکے بعد مذکورہ حصّے ہوں گے، ہر بچّے کو دو دو ۲ اور ہر لڑکی کو ایک ایک حصّہ ملیگا۔ سابقہ آمدنی جتنی بھی ہو اس کے بھی آٹھ حصّے ہوں گے اور ہر لڑکی کو ایک ایک حصّہ دیا جائیگا۔ ھٰذا ما عندی وَاللہُ اعلم بالصّواب۔

بیوی کے انتقال کے بعد مہر کی ادائیگی

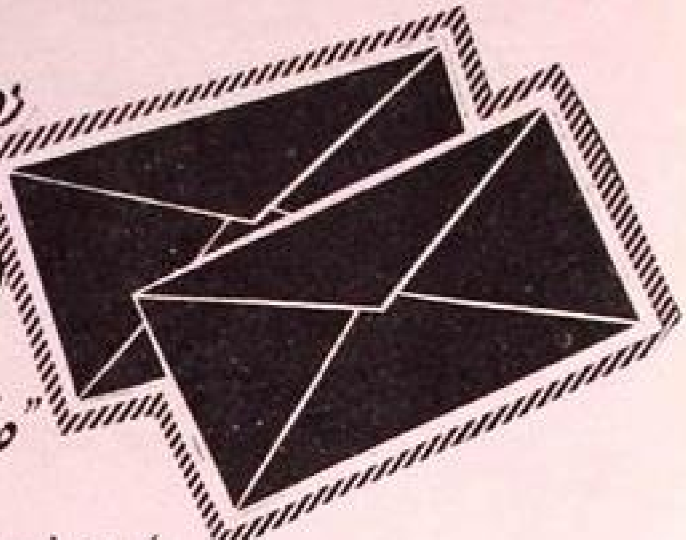
کسی کی بیوی کا انتقال ہوا اور اسکے شوہر نے بیوی کا مہر ادا نہیں کیا۔ اب چاہتا ہے کہ ادا کرے تو یہ رقم مہر کس کو دینا چاہیئے کیا یہ رقم اپنے خسر صاحب کو دے سکتا ہے یا نہیں جبکہ وہ صاحبِ استطاعت ہے اور اگر اسکی طرف سے مطالبہ کیا جائے تو کیا کیا جائے؟۔

(محمد نظام الدین) ـــــــــــــ

الجواب وباللہِ التوفیق:۔

مہر اگر زندگی میں ادا نہیں کیا جاسکا تو بعد وفات زوجہ حقِ زوج بھی اسمیں پیدا ہو جاتا ہے، اگر اس بیوی سے اولاد ہو تو چوتھائی مہر کا حقدار ہوگا ورنہ نصف مہر کا حقدار ہوگا۔ اسکو یہ حق حاصل ہے کہ اپنا حصہ وضع کر کے بقیہ مہر والدزوجہ کے حوالے کردے ہاں گر اولاد اسی بیوی سے ہو تو اپنا حصّہ نکالنے اور اولاد کا حصہ ادا کرنیکے بعد رقم حوالے کردے، اور خسر صاحب کی ذمہ داری ہوگی کہ دیگر ورثہ کو حسب سہام شرعی تقسیم کرائیں اور اولاد نہ ہو اور نہ ماں ہو تو شوہر کے حصّے کے علاوہ پورا مہر خود رکھ سکتے ہیں۔ خسر صاحب یا دیگر ورثہ کے حوالے کرنے کے لئے یہ شرط نہ ہوگی کہ وہ صاحب استطاعت نہ ہوں، وارثین تو بہر صورت اپنا حصہ جو شرعاً حق ہے لیں گے ـــــــــــــ ھٰذا ما عندی وَاللہُ اَعلم بالصّواب۔

صفا کی ڈاک



"صفا" (سہ ماہی اردو) اور "صوت السلام" (سہ ماہی عربی)

کے اجراء پر بزرگوں اور بہی خواہوں کے مسلسل خطوط ادارہ کو موصول ہو رہے ہیں، ان خطوط میں تعریف و توصیف بھی ہے اور تعمیری تنقید و تبصرہ بھی، مبارکبادی بھی اور مخلصانہ مشورے بھی، ایسے تمام خطوط ہمارے لئے اہمیت کے حامل اور تقویت کا باعث ہیں، ہماری کوشش ہے کہ ان رسالوں کو ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے خوب سے خوب تر بنائیں ــــ السعی منی والاتمام من اللہ ــــــــ (ادارہ)

◎

محترم و مکرم مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب ! زادکم اللہ مجداً وکرامۃً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ــــــــ "دار العلوم سبیل السلام" کے علمی و دینی ترجمان سہ ماہی "صفا" کے شمارہ ۳ نے ممنون و مسرور فرمایا، آپ کے علمی اور دینی فکر و ذوق کی بلندی کے ساتھ وقت و مزاجِ وقت شناسی کا اندازہ اہلِ نظر کے سامنے عہدِ طالب علمی سے آچکا تھا، اور پھر سرزمینِ حیدرآباد پر پہونچنے کے بعد یہ جوہر جس طرح طشت ازبام ہوئے، انہوں نے تو آپ کی افادی صلاحیتوں کا ہر بے غبار کو قائل کر دیا۔

سہ ماہی "صفا" کا شمارہ دیکھنے کے بعد یہ امید یقین میں تبدیل ہوگئی کہ دار العلوم دیوبند کا فیضان بواسطہ "رضوان" انشاء اللہ ملک گیر ہو جائے گا اور یہ علم و ادب اور دین و تحقیق کا سنگم بہت جلد اپنی عظمت و افادیت کا اہل نظر سے اعتراف کرائے گا ــــــــ خدا کرے جلد ہی وہ وقت آئے کہ قدر شناسانِ علم و تحقیق کو مژدۂ انتظار سے منزلِ صفا تک سعی کا ایک "شوط" پورا کرنے میں تین ماہ کی جگہ ایک ماہ لگنے لگے ــــــــ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمت کو برکت اور خدمت کو مقبولیت سے نوازے اور آپ کی یہ سعی مستجاب ہو۔

(مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحب) مہتمم وقف دار العلوم ...

عزیز گرامی ! سلام مسنون۔

یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی ہے کہ ابھی کچھ ایسے نوجوان اہلِ علم اس ملک میں موجود ہیں، جن کا ذوق واقعی صاف ستھرا ہے، اور علمی مسائل کی تحقیق ان کا مشغلہ ہے، بلکہ نئے مسائل پر محنت کرتے کراتے ہیں اور دوسروں تک پہونچاتے ہیں، اس کی تازہ مثال جریدۂ "صفا" کا اجراء ہے، جو حیدرآباد جیسے مردم خیز شہر سے منصۂ شہود پر آیا ہے، اور اس کے اکثر وبیشتر ہی نہیں بلکہ کل مضامین تحقیقی ہیں اور لکھنے والوں نے پوری محنت سے لکھا ہے، تاکہ دوسرے اہلِ علم اس سے مستفید ہوں اور ان کا جمود ٹوٹے اور نئے فقہی مسائل پر زمانۂ حال کو سامنے رکھ کر سوچنے اور فیصلہ کرنے کا ملکۂ راسخہ پیدا کرنے کی جد وجہد کریں۔

کوئی شبہ نہیں کہ بہت سارے ایسے مسائل سامنے ہیں، جن پر دوبارہ حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر غور کرنے کی ضرورت ہے، متقدمین نے اپنے دور کے مطابق ان غیر منصوص مسائل پر غور وفکر کرکے رائے قائم کی تھی، مگر ظاہر ہے کہ عرف وعادت کے بدلنے سے اجتہادی مسائل بدلتے ہیں اور ان کو بدلنا چاہئے۔

اسلام ایک ابدی دین ہے، جو قیامت تک کے لئے آیا ہے اور تمام خطۂ دنیا کیلئے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجا گیا ہے، اس لئے اس کے مسائل پر اسی نقطۂ نظر سے غور وفکر ہونا چاہئے اور نوجوان علماء دین کو بلندیِ فکر سے کام لینا چاہئے، مجتہد فیہ مسائل میں غور وفکر کی ہمہ وقت گنجائش ہے، شرط یہ ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں ہو، نیز اقوال صحابۂ کرام اور ائمۂ مجتہدین کے اصول سے انحراف نہ ہو۔

اس سال دو نئے سہ ماہی رسالے شائع ہوئے ہیں، ایک پھلواری شریف پٹنہ سے، جس کے مدیر ہمارے قاضی شریعت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی ہیں اور دوسرا حیدرآباد سے، جس کے ایڈیٹر ہمارے عزیز مولانا محمد رضوان القاسمی ہیں، یہ دونوں ماشاء اللہ ملک وملت کے سچے بہی خواہ ہیں اور اسی کے ساتھ علمی مسائل اور ان کی تحقیق سے شغف رکھتے ہیں اور اپنی تحقیق میں کامیاب ہیں اور اپنی اپنی جگہ آفتاب وماہتاب ہیں، جن کی کرنوں اور نورانی شعاعوں سے عوام وخواص دونوں کے قلوب منور ہوتے ہیں، اللہ تعالےٰ ان حضرات کو نظرِ بد سے بچائے اور دین وملت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع عنایت فرمائے۔

تذکرہ رسالہ "صفا" حیدرآباد کا تھا، میں نے اس کی غالباً دو قسطوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، دل سے دعائیں نکلیں اور بہت سی علمی باتیں جو ذہن میں دبی دبائی تھیں ابھر گئیں اور محسوس ہوا کہ علمی میدان اب بھی بڑا وسیع ہے اور کام کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسالہ کے کارکنان پوری ملت کی طرف سے لائقِ تبریک وتہنیت ہیں اور ہر طرح سے حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور ان کا یہ کام مسلسل جاری رکھے۔ نعم المولیٰ ونعم النصیر خاکسار اپنے قدیم رشتہ سے دلی مبارکباد پیش کرتا ہے، گو اس مبارکباد کی کوئی قیمت نہیں۔ عزیزم مولانا خالد سیف اللہ صاحب معاون مدیر بھی قابل صد ستائش ہیں کہ جن کا قلم رواں دواں رہتا ہے اور جن کا اس رسالہ میں بڑا حصہ ہے۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

طالب دعا

(مولانا مفتی) محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی، مفتی دار العلوم دیوبند۔

○

محترم المقام جناب مدیرانِ "صفا" اور "صوت السلام"! سلام مسنون۔

عرصہ سے "صفا" کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا، مگر گوناگوں مصروفیات مانع رہیں، اسی درمیان انگلینڈ کا سفر بسلسلۂ ہاسپٹل اور میڈیکل کالج وغیرہ رہا۔ ابھی واپسی پر پھر کام کے اژدہام نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے، پھر بھی آپ حضرات کی مخلصانہ سعی اور محبت نے وقت پا ہی لیا۔ "صفا" اپنی زیبائش ظاہری و باطنی میں خود اپنی مثال ہے اور مستقبل کا شاہکار اور امید افزا رسالہ ہے، اللہ تعالیٰ نفع بخش بنائے، جامعہ اسلامیہ قاسمیہ نے اسی وجہ سے خریدار کی فہرست میں شرکت کر لی ہے۔ امید کہ برابر رسالہ سے فیضیاب فرماتے رہیں گے ———— والسلام۔

(مولانا) عبد الحنان (صاحب) دار العلوم ماٹلی والا بھروچ گجرات

○

مکرمی! تسلیم مع التکریم۔

شکریہ قبول فرمائیں کہ آپ نے "صفا" کے دو شماروں سے سرفراز فرمایا۔ زوالِ علم کے اس دور میں آپ کی یہ کاوش بے حد مستحسن ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ اسلام فہمی کے راستے میں جو بھی قدم اٹھایا جائے گا وہ مبارک ہوگا۔ دعا ہے کہ یہ قدم مبارک تر ثابت ہو، آمین۔

"صوت السلام" سے آپ نے کیوں محروم رکھا، ازراہ کرم یہ بھی ارسال فرماتے رہنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

(جناب) اکبر علی خاں، عرشی زادہ، رام پور۔

مکرم ومحترم حضرت مدیر اعلیٰ "صفا" "وصوت السلام" دامت برکاتہم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خدا کرے آپ بعافیت ہوں ——— "صفا" اور "صوت السلام" کے اب تک تین شمارے دفتر کو موصول ہوئے، عنایت کا بہت بہت شکریہ، ان شماروں کو پڑھ کر دل سے دعا نکلی، اللہ تعالےٰ آپ حضرات کی مساعی حسنہ کو قبول فرمائے اور ان پرچوں کے ذریعہ پیغامِ نبوتؐ کی اشاعت ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر ہوتی رہے، یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی ترقیوں سے نوازے اور جملہ شر وفتن سے حفاظت فرمائے آمین۔

دفتر کے جملہ اسٹاف آپ کی خدمت میں ہدیۂ سلام پیش کرتے ہیں۔

(مولانا) **محمد عزیز القاسمی**، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

○

محترم جناب مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب! زید مجدہ السامی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج گرامی! "صفا" کے اجراء پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء کا شمارہ نظر نواز ہوا ماشاء اللہ مفید ترین مضامین پر مشتمل ہے ——— توحید کے موضوع پر مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کی نظم "ہو اللہ احد" خاص طور پر باعثِ مسرت ہوئی۔ عرصہ پہلے حمد باری کے موضوع پر نظم کا رواج تھا لیکن اب یہ رواج قریب قریب ختم ہے، آپ کے رسالہ میں اس عنوان کو دیکھ کر دل سے دعا نکلی اور مبارکباد پیش کرنے کو ضروری جانا۔

بابری مسجد پر مولانا برکت اللہ صاحب جوہر قاسمی کی نظم بھی زوردار ہے۔ آپ اگر ردِ قادیانیت پر چاہیں تو مضمون بھیجدوں۔ مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کو فرما دیجئے، بلکہ یہ خط ہی ان کو دیدیجئے۔ والسلام۔

(مولانا) **محمد عارف ندوی سنبھلی**، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

○

محترمی ومکرمی! زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،۔

"صفا" کا خصوصی شمارہ (جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۸۹ء) باعثِ سرفرازی ہوا۔ اس نوازش کے لئے بے حد ممنون ہوں، جزاک اللہ فی الدارین خیرا۔ ماشاء اللہ صوری ومعنوی دونوں طور پر پرچہ اچھا ہے، اللہ تعالےٰ مزید ترقی عطا فرمائے آمین ——— انشاء اللہ عنقریب زرِ خریداری بھیجوں گا، اس لئے اس کے دوسرے شمارہ سے محروم نہیں فرمائیں گے

پرچہ کو اور معیاری بنانے کی ضرورت ہے، امید ہے کہ آپ ضرور توجہ فرمائیں گے، مضامین اور وقیع ہونے چاہئیں، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں جو پروف ریڈنگ میں بہ آسانی دور کی جاسکتی ہیں۔ حواشی و حوالہ جات کے بارے میں ناچیز کی ناقص رائے یہ ہے کہ ہر حوالہ ہر صفحہ کے فٹ نوٹ میں دیا جائے، یک جا دینے میں یہ دقت ہے کہ بار بار حواشی والے صفحہ کو الٹ الٹ کر دیکھنا پڑتا ہے، جس سے مطالعہ میں الجھن سی ہوتی ہے اور انہماکِ مطالعہ قائم نہیں رہتا، جب کہ ہر صفحہ پر اگر حوالہ حاشیہ موجود ہو تو بغیر کسی الجھن کے مطالعہ جاری رہتا ہے، ویسے یہ میری رائے ہے، میں نے جو بات مناسب و مفید سمجھی لکھ دی ہے۔ والسلام مع الاکرام۔

جناب **محمد ضمان اللہ** ندیم مہتمم مدرسہ اسلامیہ شکرپور در بھنگہ۔

○

اخی محترم، صدیق مکرم! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاجِ گرامی! مولانا جمیل الرحمٰن صاحب قاسمی بھیونڈی تشریف لائے، "صفا" کے تین شمارے موصول ہوئے اور ایک کتاب "عہدِ حاضر کے فقہی مسائل" بھی ملی۔ بہت دنوں سے چاہتا تھا کہ کوئی علمی سہ ماہی پرچہ کسی دینی مدرسہ سے نکلتا تو اچھا ہوتا، کئی بار قاضی اطہر مبارکپوری سے کہا کہ آپ شیخ الہند اکیڈیمی کے سرپرست ہیں، وہیں سے نکالئے، مگر ان کا جواب سن کر مایوسی ہوئی کہ کوئی لکھنے والا صاحبِ ذوق ملتا نہیں، کس سے مضامین لکھواؤں۔

ابھی چند دنوں قبل پھلواری شریف پٹنہ سے "بحث و نظر" آیا، اس کا مطالعہ کیا، دل کو اطمینان ہوا کہ ابھی لوگوں کو فکر ہے، اللہ کے ایسے نیک بندے ہیں جو اس کام کو کر رہے ہیں، دس کاپیوں کی ایجنسی جاری کرا دیا ہے، اس کے بعد مولانا جمیل صاحب سے آپ کے علمی کام کے ہدایا ملے، اس کو دیکھ کر مزید خوشی ہوئی، میری طرف سے آپ کو اور رحمانی صاحب کو مبارکباد دی، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اس نیک کام کے لئے قبول فرمائے، "صفا" کی ایجنسی پر کیا کمیشن ہے، مقامی ایجنٹ نے معلوم کیا ہے، فی الحال دس کاپیوں کی ایجنسی لینا ہے اصول و ضوابط تحریر فرمائیں۔

"عصرِ حاضر کے فقہی مسائل" فی الحال دس عدد تاجرانہ نرخ پر وی، پی کر دیں، اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ مزید آرڈر جائے گا۔ فقط۔ والسلام۔

ڈاکٹر منظور احمد انصاری قاسمی، بھیونڈی، مہاراشٹرا۔

محترم و مکرم حضرت ناظم صاحب مدظلہ العالی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا —— عرض یہ ہے کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدظلہ استاذ حدیث مدرسہ سبیل السلام حیدرآباد کی معرفت دو کتابیں موصول ہوئیں۔ (۱) "عصر حاضر کے فقہی مسائل" (۲) سہ ماہی رسالہ "صفا" دونوں ہی ماشاء اللہ بہت خوب ہیں۔ مدرسہ کا رسالہ پڑھ کر اساتذہ کرام کی علمی صلاحیت واستعداد کی پختگی معلوم ہوتی ہے۔ موصولہ رسالہ اہم مضامین پر مشتمل ہے، جو اہلِ علم اور علمی ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ہے، اللہ جل شانہٗ اسے مقبول خاص وعام بنائے۔ آمین۔

"عہدِ حاضر کے فقہی مسائل" میں تو سائنسی پہلو لئے ہوئے مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ اللہ جل شانہٗ مؤلف موصوف کو اس پر اجر عظیم عطا فرمائے اور اہم دینی مسائل کی توضیح کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

(مولانا) عبدالرحیم قاسمی، امام مسجد پرنسب اسٹریٹ۔ کلکتہ۔

○

مکرمی مدیر "صفا" وصوت السلام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

رسالے "صفا" و "صوت السلام" اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۰۰ء موصول ہوئے، جوں جوں پڑھتا گیا دل خوشیوں سے جھوم اٹھا، اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی کوششوں کو قبول فرمائے، دونوں رسالے یقیناً اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کے اعتبار سے بہت عمدہ، نہایت دل پسند اور جاذبِ قلب و دماغ ہیں، زبان نہایت شگفتہ و شستہ اور مقاصد بھی نہایت اعلیٰ ہیں، اس میں زمانۂ حال کی بڑی نباضی ہے۔ نیز نہایت بروقت پیش رفت بھی ہے، درحقیقت یہ رسالے قلب و نظر کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اس دور میں کسی رسالہ کا اجراء، پھر اس کی بقاء کی کوشش کرنا ہاتھی پالنے کے مترادف ہے، مگر امت کی ضرورت اور ملت کی بہبود اسی میں ہے کہ دینی مجلات زیادہ سے زیادہ شائع کئے جائیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کے تمام بانیین و معاونین اور ہر قسم کے تعاون کرنے والوں کو ان کے مقاصد حسنہ میں بھرپور کامیابی عطا فرمائے اور ان رسالوں کے ذریعہ علم و تحقیق کے میدان میں قوم و ملت کی تادیر خدمت ہوتی رہے۔ تمام ہی کارکنان، بالخصوص مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کی خدمت میں ہدیۂ سلام عرض ہے۔ فقط، والسلام۔

(مولانا) محفوظ الرحمٰن صاحب، فاروقی مہتمم دارالعلوم نعمانیہ، پاتھر روڈ، پربھنی۔

خبرنامہ
دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

مولانا محمد یوسف نقشاتی

○ مورخہ ۷ ارتا ۲۰ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مدرسہ میں امتحان ششماہی ۱۴۰۹ھ منعقد ہوا اور مورخہ ۱۳ ربیع الثانی کو نتائج کا اعلان ہوا، پورے مدرسہ میں مختلف تعلیمی شعبوں میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے طلباء کے نام اور ان کے نمبرات کے اوسط اس طرح ہیں:۔

شعبۂ عربی میں اوّل : خالد حسین صدیقی (ہفتم عربی) نمبرات کا اوسط ۸۹ ۔

〃 〃 دوم: قمر عالم (اوّل عربی) 〃 〃 ۸۶ ۔

〃 〃 سوم: احمد عبد الرؤف (دوم عربی) 〃 〃 ۸۵ ۔

شعبۂ حفظ و ناظرہ میں اوّل : قمر الدین (حفظ ج) نمبرات کا اوسط ۸۳ ۔

شعبۂ ابتدائی میں اوّل : تاج الدین (دوم اردو) 〃 〃 ۹۲ ۔

○ مورخہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ کو شعبۂ تحریر و تقریر کی طرف سے تقریر، مقالہ نویسی اور بیت بازی کا انعامی مقابلہ منعقد ہوا جس میں ۷ طلبہ نے تقریر، ۴ طلبہ نے مقالہ نویسی میں اور ۱۰ طلبہ نے بیت بازی میں شرکت کی۔ مقالات میں خالد حسین نے اوّل، حیدر علی نے دوم اور فیاض عالم نے سوم انعام حاصل کیا، امتیاز احمد کو ترغیبی انعام دیا گیا۔ تقریری مقابلہ میں انعام اوّل محمود علی، سعد الدین مصلح الدین کو انعام دوم تاج الدین کو انعام سوم وحید اللہ کو اور ظفر الاسلام اور احمد عبد الرؤف کو ترغیبی انعام دیے گئے۔ بیت بازی کا وقت دس منٹ تھا، جو ۲۵ منٹ تک بڑھایا جاتا رہا، لیکن پھر بھی مقابلہ غیر مختتم رہا۔ اس طرح دونوں گروپ، الف، ب پر بیت بازی کا انعام مساوی طور پر تقسیم کر دیا گیا ——— یہ تقریب نہایت باوقار اور پر اثر تھی حضرت ناظم صاحب نے صدارت کی، شیخ الحدیث نے تحکیم کے فرائض انجام دیے اور اخیر میں مولانا خالد سیف اللہ صاحب صدر مدرس نے نصیحت فرمائی۔

○ مجلس علمیہ آندھرا پردیش کے سہ ماہی اجلاس منعقدہ ۱۵ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مریال گوڑہ میں

شرکت کے لئے حضرت ناظم صاحب، جناب صدر مدرس صاحب اور جناب مولانا برکت اللہ صاحب مریال گوڑہ تشریف لے گئے، اسی دن شب میں مولانا مفتی امان اللہ صاحب کے زیر نگرانی مدرسہ مدینۃ العلوم مریال گوڑہ کا جلسۂ دستار بندی بھی منعقد ہوا، اسی موقعہ سے ریاست کے دیگر علماء کے ساتھ دار العلوم سبیل السلام کے مذکورہ اساتذہ و ذمہ داران کا خطاب بھی ہوا۔

○ مورخہ ۱۹ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ کو حضرت ناظم صاحب، حضرت مولانا برکت اللہ صاحب اور حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب قاسمی کا سفر نلگنڈہ ہوا اور ان حضرات نے جلسۂ سیرت النبیؐ سے خطاب فرمایا۔ پھر ۲۲ ربیع الاول کو حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کا بھی ایک اور جلسہ کے سلسلہ میں نلگنڈہ کا سفر ہوا، اور آپ نے سیرت کے موضوع پر خطاب کیا۔

○ حضرت ناظم صاحب "نعتیہ شاعری" کے موضوع پر منعقدہ سمینار اور "پیام انسانیت" کے اجلاس میں شرکت کے لئے اورنگ آباد تشریف لے گئے۔ یہ سمینار اور اجلاس مدرسہ کاشف العلوم اورنگ آباد کے زیر اہتمام منعقد ہوا، بعد میں حضرت ناظم صاحب نے اس مذاکرہ اور اجلاس کے سلسلہ میں اپنی تاثراتی رپورٹ بھی تحریر فرمائی جو روزنامہ سیاست حیدر آباد میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کو ملاحظہ کرنے کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ نے ناظم صاحب (مولانا محمد رضوان القاسمی) کے نام تحریر کردہ مکتوب گرامی (۳ر نومبر ۱۹۸۸ء) میں لکھا ہے:-

"پونہ کے سمینار کی طرح اورنگ آباد کے سمینار کی بھی یہ بڑی سنجیدہ اور مؤثر روئیداد ہے، ہر ایک اس کو اس خوبی کے ساتھ پیش نہیں کر سکتا تھا، جدید حلقۂ احباب میں آپ سے خاص انس معلوم ہوتا ہے اور آپ کی فکری و قلمی صلاحیت سے خاص تاثر و مناسبت محسوس ہوتی ہے، انشاء اللہ سید جمیل الدین صاحب اور آپ حضرات کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق اواخر دسمبر یا اوائل جنوری میں حیدر آباد حاضری ہوگی۔ اللہ تعالے اس کی باحسن وجوہ توفیق اور تکمیل فرمائے۔"

○ جناب صدر مدرس مدرسہ ہذا کے نام "انسٹی ٹیوٹ آف آبجکیٹو اسٹیڈیز دہلی" کی طرف سے ایک کل ہند کانفرنس منعقدہ ۲۲ر اکتوبر ۸۸ء میں شرکت کی دعوت آئی اور "مہر- جو ادا نہیں کیا جاتا" کے عنوان پر مقالہ لکھنے کی خواہش کی گئی، مگر مدرسہ کی مصروفیات کی وجہ آپ اس اجلاس میں

شریک نہ ہوسکے، البتہ اپنا مقالہ بھیجدیا، جو اس کانفرنس کے یادگار مجلہ میں شریکِ اشاعت کرلیا گیا۔

○ ۹؍ربیع الثانی کو حضرت ناظم صاحب کا ایک سفر ورنگل بھی ہوا، جہاں کئی اجلاسِ عام منعقد ہوئے اس اجلاس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے حضرت مولانا محمد سالم صاحب مہتمم دار العلوم (وقف) دیوبند بھی مدعو اور شریک تھے۔ مدرسہ ہٰذا سے حضرت ناظم صاحب کے علاوہ شیخ الحدیث مولانا زبیر احمد صاحب اور راقم الحروف بھی شریک ہوئے۔

○ مدرسہ سے حسب معمول طلبار کی جماعتیں نکلتی رہیں، جو قریب کے محلوں میں دعوت و تبلیغ کے فرائض انجام دیا کرتی ہیں، ان کے علاوہ صدر مجلس انتظامی مدرسہ ہٰذا جناب الحاج سید ضیار الرحمٰن صاحب نے راجمنڈری اور ورنگل کے تبلیغی اسفار کئے، راجمنڈری کے سفر میں موصوف کے ساتھ حضرت مولانا برکت اللہ صاحب اور ورنگل کے سفر میں حضرت ناظم صاحب بھی شریک تھے ——— دہلی میں علمار کے خصوصی اجتماع میں شرکت اور آندھرا پردیش کے لئے اکابر تبلیغ کو دعوت دینے کی غرض سے ۷؍ربیع الاول ۱۴۰۹ھ کو ایک وفد گیا، اس میں مولانا مفتی عبدالودود صاحب نے مدرسہ ہٰذا کی نمائندگی کی، راقم الحروف نے دہلی کے علاوہ اس موقع سے جلال آباد کا بھی سفر کیا اور مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب مدظلہ سے ملاقات کرکے ان کو حیدرآباد اور مدرسہ ہٰذا کو تشریف آوری کی دعوت دی۔

○ کھمم کے بعض علاقوں میں قادیانیت کا فتنہ بال و پر نکال رہا ہے، اس کی سرکوبی کے لئے مجلس علمیہ کی طرف سے ہر ماہ علمار کی ایک جماعت کا ان علاقوں میں بھیجا جانا طے پایا ہے، اس سلسلے میں پہلی جماعت نے حضرت مولانا برکت اللہ صاحب استاذِ حدیث مدرسہ ہٰذا کی زیرِ قیادت ان علاقوں کا کامیاب دورہ کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس فتنہ کا استیصال فرمائے۔

○ شہر میں بھی مدرسہ کے ذمہ داران اور اساتذہ کی تبلیغی اور اصلاحی مہم جاری رہی، صدر مدرس صاحب نے اسٹڈی سرکل تعمیر ملت کے زیر اہتمام "پیغمبر اسلامؐ اور دشمنانِ اسلام" کے عنوان پر خطاب فرمایا، حضرت ناظم صاحب نے ارم کالج اعظم پورہ کے ہفتہ وار اجتماع میں مولانا حالی کی مسدس کی معنویت اور "عورت اور نظامِ فطرت" کے عنوان پر اظہارِ خیال فرمایا، ۱۲؍دسمبر ۸۸ء کو فتح منزل، فرسٹ لانسر میں بھی آپ کا خطاب "عظمتِ قرآن" کے موضوع پر ہوا، اس خصوصی مجلس کے داعی جناب ریاض احمد صدیقی تھے، جن کے دوسرے فرزند نے قرآن حکیم کے حفظ کی تکمیل کی ہے اور اسی مناسبت سے یہ مجلس منعقد کی گئی تھی۔

○ قارئین کو یاد ہوگا کہ مدرسہ ہذا کی ایک شاخ ورنگل میں بھی ہے، جس کو مولانا یوسف زاہد صاحب بحسن وخوبی چلا رہے ہیں۔ حضرت مولانا محمد سالم صاحب نے ۱۰ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ کو اس شاخ میں طلبہ کو حدیث کی معروف و مقبول کتاب "ریاض الصالحین" شروع کرائی اور کتاب کی پہلی حدیث پر نہایت عالمانہ تقریر فرمائی۔ اس کے بعد اہلِ ذوق شرکا نے مولانا سے بعض علمی سوالات کئے جن کے جواب مولانا نے نہایت ہی مدلل اور مؤثر انداز میں دئے۔

○ ۲۴ صفر ۱۴۰۹ھ کو عارف باللہ حضرت الاستاذ قاری امیر حسن صاحب مدرسہ ہذا میں تشریف لائے، مدرسہ کا معائنہ فرما کر اظہارِ مسرت کیا، آپ کی آمد پر ایک جلسہ بھی منعقد ہوا، اس موقعہ سے آپ نے طلبہ کو اساتذہ کا احترام، کتابوں کا احترام، زبان کی جھوٹ سے حفاظت وغیرہ کے متعلق نصیحتیں کیں، اساتذہ کی علاحدہ نشست میں بھی اخلاص کی اہمیت پر روشنی ڈالی، اس موقعہ سے مدرسہ کے دو طالب علم سید عبد العظیم بخاری اور کلیم الدین کا حفظ قرآن مجید بھی ختم کرایا۔

○ مورخہ ۱۷ ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ کو مدرسہ کے ایک ہونہار طالب علم عبد العزیز (جماعت چہارم عربی) کا اچانک علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ عزیز مرحوم نے ایک دن پہلے تک اسباق میں شرکت کی، رات بھی اچھے رہے، دن کے ۱۲ بجے بے ہوشی کا دورہ پڑا اور چند ہی ساعت میں انتقال ہوگیا، خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کے والدین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، اس حادثہ نے مدرسہ کی پوری فضا کو غم انگیز کر کے رکھ دیا اور شاعر کا یہ شعر ذہن میں آنے لگا کہ ؎

پھول تو اپنی بہارِ جانفزا دکھلا گئے ∴ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

تاہم یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ موت اپنے وقت پر آتی ہے، جس پر کامل اختیار خالق کائنات ہی کو ہے اور اس معاملے میں بندے کی ہر تدبیر خدا کی تقدیر کے سامنے ناکام ہو جاتی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے ؎

مولی، مالی، بڑا گیانی، کلی کلی کل جوڑے رے ∴ کچے پکے کا حال نہ جانے جس کو چاہے توڑے رے

اس میں کوئی شک نہیں کہ تحصیلِ علم کے راستے کی موت میدانِ جہاد کی موت ہے، جسے شہادت ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور مردِ مجاہد کا مآل تو بس "شہید" یا "غازی" ہی ہے۔ بقول شاعر ؎

رہِ جہاد میں ذکرِ شکست کیا معنیٰ ∴ مآل مردِ مجاہد شہید یا غازی

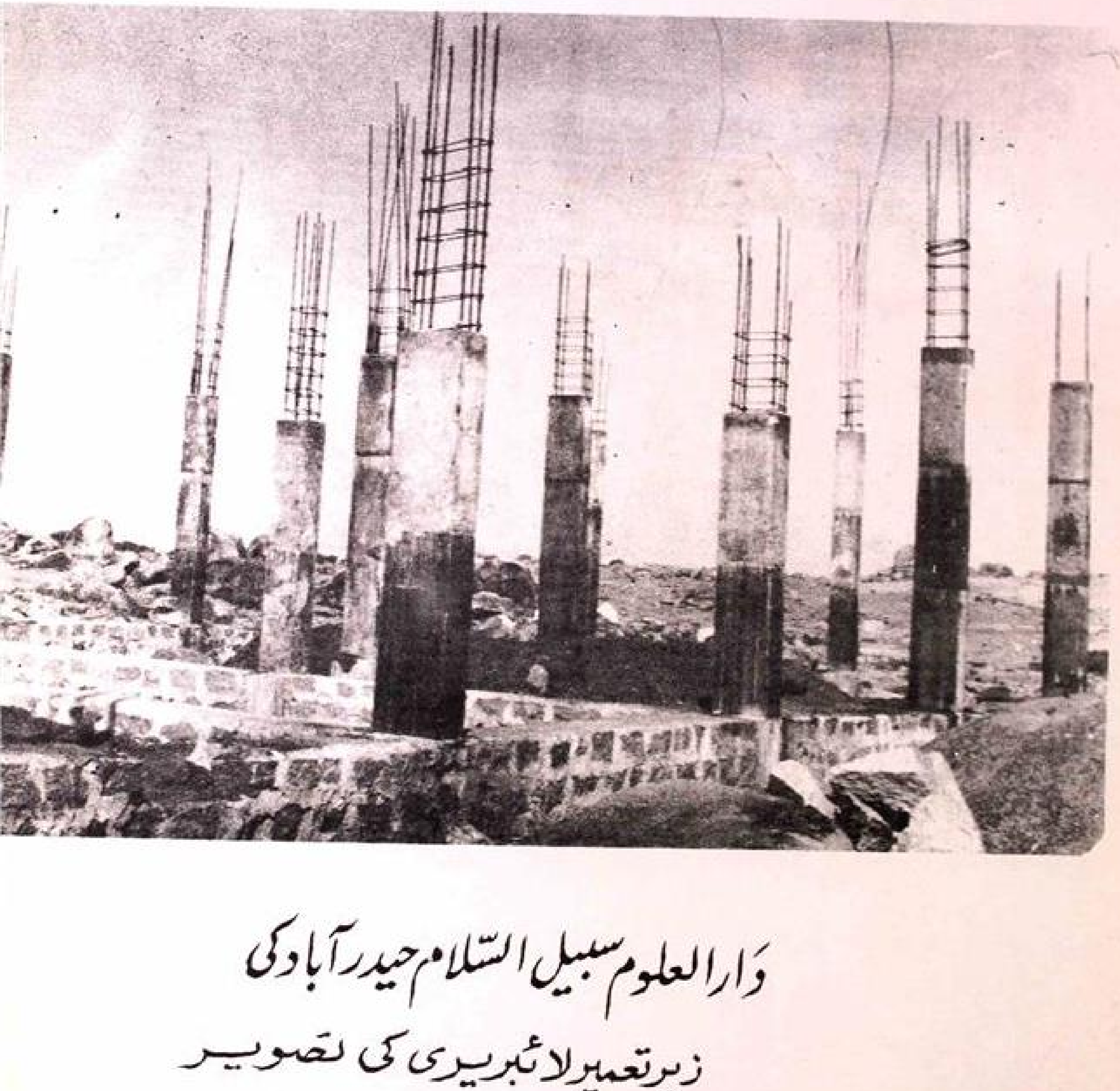
○ "صوت السلام" کا تیسرا شمارہ چھپ کر ممبروں تک روانہ کیا جا چکا ہے اور "صفا" کے چوتھے شمارہ کے ساتھ اس عربی مجلہ کا چوتھا شمارہ بھی پریس میں جا رہا ہے —— مقامِ مسرت ہے کہ جناب صدر مدرس صاحب کی کتاب "قاموس الفقہ" جو اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور فقہی انسائیکلو پیڈیا ہے، کی پہلی جلد چھپ کر آگئی ہے، امید ہے کہ مستقبل قریب میں اس کی رسم اجرار کی تقریب منعقد ہوگی۔ مدرسہ کا کیلنڈر بھی آخری مرحلہ میں ہے اور بہت جلد چھپ کر منظر عام پر آجائے گا۔

○ مدرسہ کا تعمیری کام بھی تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ درس گاہ کے ایک بلاک کی تعمیر مکمل ہونے کے قریب ہے، دوسرے بلاک پر بھی جلد ہی چھت پڑ جائے گی، اس کے ساتھ لائبریری کا کام بھی تیزی سے جاری ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ رمضان المبارک تک درس گاہ اور کتب خانہ کی جدید عمارت پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گی۔

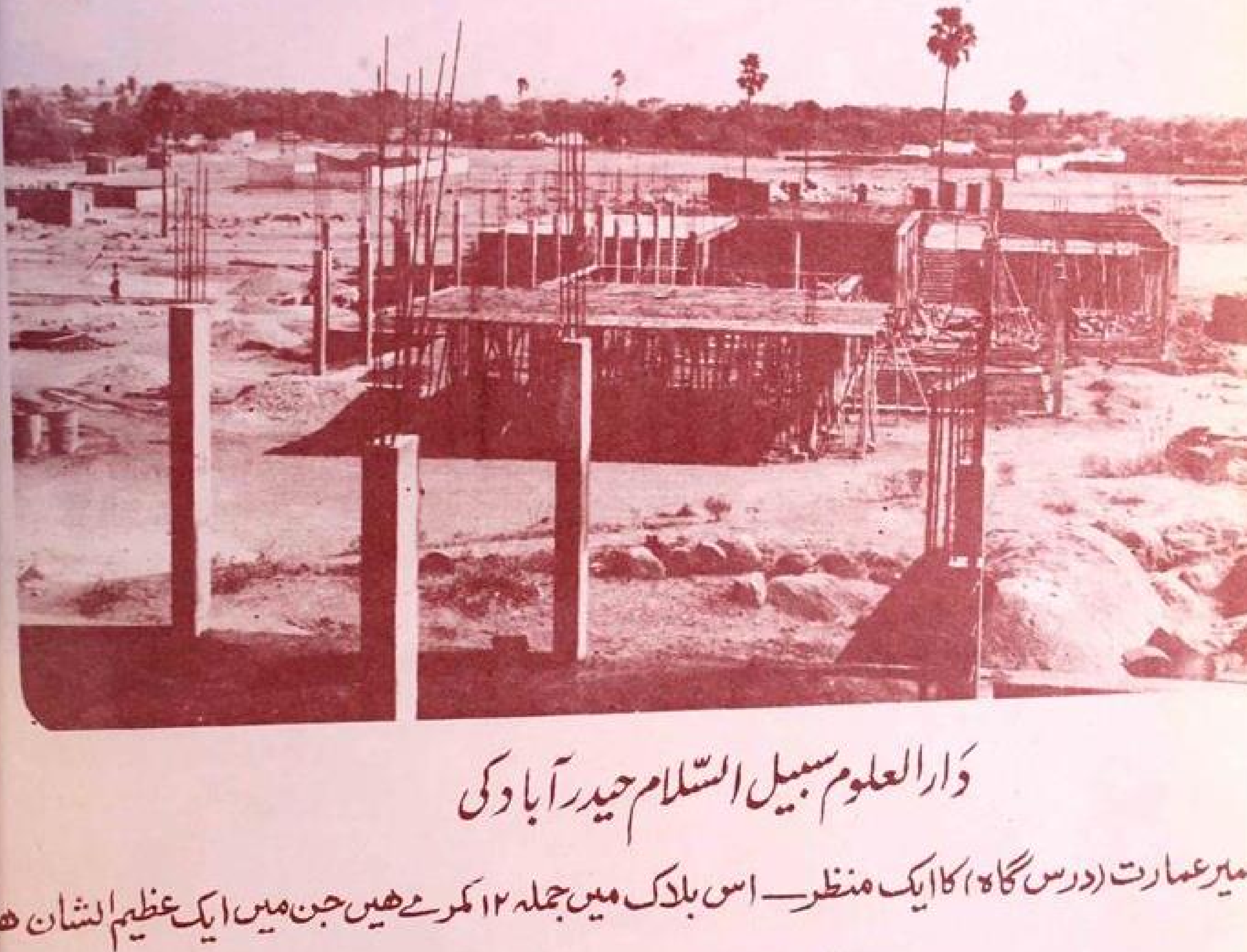
ع: تکمیل تو ان کی مرضی پہ ہے، اب راہ تو ہم نے پالی ہے

○ مورخہ ۲۹ر جمادی الاول ۱۴۰۹ھ کو محترم جناب علی با عامر (شارجہ) جناب محمد سلمان صدیقی (دوبئی) جناب شہاب الدین صاحب (دوبئی) اور جناب تاج احمد خاں (دوبئی) تشریف لائے اور درس گاہ انتظامی شعبہ جات تعمیری کام، جو بحمد اللہ اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہے۔ کا تفصیلی معائنہ کیا اور اس پر اپنی مسرت اور تعلق خاطر کا اظہار کیا۔

○ محترم حافظ عبد الرشید صاحب مبلغ مدرسہ ہذا نے فراہمیِ مالیات اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے لئے جنوبی ہند کے شہروں اور علاقوں کے مختلف کامیاب اور مفید دورے کئے بعض حضرات نے کثیر تعداد میں حصیر، قالین اور طلبہ کے لئے کپڑوں سے تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان حضرات اور دوسرے معاونین کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ مدرسہ ہی کے کام سے حافظ صاحب موصوف کی معیت میں راقم الحروف نے بھی دہلی دیوبند وغیرہ کا سفر کیا، جس میں مدرسہ کے کتب خانہ کے لئے کتابوں کے آرڈر دئے گئے۔



دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد کی
زیر تعمیر لائبریری کی تصویر



دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی

ـمیر عمارت (درس گاہ) کا ایک منظر — اس بلاک میں جملہ ۱۲ کمرے ھیں جن میں ایک عظیم الشان ھ

دارالحدیث کا بھی ہے

Phone:239450

DARUL-ULOOM
SABEELUSSALAM
Sabeel Nagar, Balapur, Behind
Hyderabad-500 005. A.P.(India)